قیمت : -/10روپے

اگست 2009

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب کپل سبل نے 25 جون کی شام کو اپنی سرکاری قیامگاہ سے قومی اردو کونسل کی مطبوعات کی موبائل وین کو، جسے ''اردو کتابوں کی موبائل نمائش'' کا نام دیا گیا ہے، ہری جھنڈی دکھا کر اتر پردیش کے ان اضلاع کے لیے روانہ کیا جہاں اردو لکھنے پڑھنے والے قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔ ''اردو کتابوں کی موبائل نمائش'' میں مختلف موضوعات پر اردو کونسل کی مطبوعات دستیاب ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

11 جولائی 2009 کو انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کی طرف سے ڈاکٹر طاہر محمود کو اسلامی قوانین کی تفہیم و تشریح کے سلسلے میں ان کی اہم خدمات کے لیے شاہ ولی اللہ ایوارڈ پیش کیا گیا۔
یہ ایوارڈ ایک لاکھ روپے اور سند توصیف پر مشتمل ہے۔ تصویر میں پروفیسر طاہر محمود، جی ای داون وتی سے سند توصیف حاصل کرتے ہوئے۔
تصویر میں اے آر کشمن اور راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیئرمین کے رحمن خاں بھی نظر آرہے ہیں۔

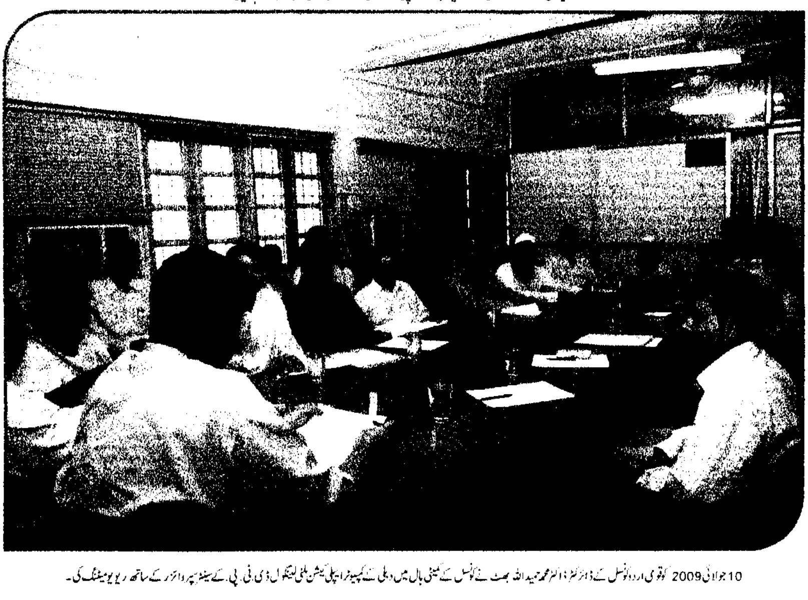

10 جولائی 2009 کو قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے کونسل کے میٹنگ ہال میں دہلی کے کمپیوٹر اپلی کیشن ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کے سینٹر سپروائزر کے ساتھ ریویو میٹنگ کی۔

اردو دنیا

قومی اردو کونسل کا ماہانہ رسالہ

جلد۔11، شمارہ۔8، اگست 2009

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

اعزازی مدیر: مخمور سعیدی

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urduduniyancpul@yahoo.co.in
urducouncil@gmail.com

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

آپ کی بات .... قارئین کے خطوط 2

ہماری بات .... ادارہ 6

زبان اور تعلیم

- ہمارا نظام تعلیم — اصلاح کا متقاضی .... عبدالغنی شیخ 7
- زبان کی تدریس کے طریقۂ کار .... چمن آرا خان 9
- اعلیٰ تعلیمی نظام میں تبدیلی: وقت کی ضرورت .... مرتضیٰ علی اطہر 11

ادب و صحافت

- منیب الرحمن اور ہجر و فراق کی نظمیں .... ابوالکلام قاسمی 13
- تحریک آزادی اور پریم چند .... ابرار رحمانی 16
- نثار احمد فاروقی .... سرورالہدیٰ 19
- اردو اخبارات کے لسانی وتہذیبی سروکار .... شکیل اختر 23
- پیغمبر اسلام کو منظوم خراج عقیدت .... ہندوستان ٹائمز 26

کلاسیکی ادب

- غزلیات ولی .... ولی دکنی 27
- غزلیات سراج .... سراج اورنگ آبادی 28
- سیر تیسرے درویش کی .... میر امن دہلوی 29

صحت اور ٹیکنالوجی

- سوائن فلو .... شمیم احمد صدیقی 35
- ای بکس یعنی الکٹرانک کتابیں .... خان قمر الزماں 37

کیریئر

- بیرونی ممالک میں تعلیم کے لیے ٹیسٹ .... محمد اعجاز 39

روبرو

- زبیر رضوی سے گفتگو .... شہپر رسول 41

ہماری مطبوعات سے

- خواجہ میر درد: عشقیہ شاعری کے آئینے میں .... خلیل الرحمن اعظمی 46

اردو خبرنامہ .... ادارہ 51

تبصرہ و تعارف 71

- کلیات ولی .... احمد نفیل ....
- اٹھارہ سو ستاون کے راہنما .... نوشاد عالم ....
- آؤ سمندر کی سیر کریں .... مرتضیٰ علی اطہر ....
- جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ .... شہزاد انجم ....
- جستجو .... ارشد علی خاں ....

بچوں کا گوشہ

- گیان پیٹھ انعام اور اردو ادیب .... محمد عبداللطیف 76
- میں اردو ہوں .... عبدالرشید اعظمی 79

آپ کی بات

■ ابن کنول، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی-110007

گذشتہ برسوں میں آپ کی آمد سے جو کونسل کو پورے ملک میں ایک وقار ملا تھا وہ انشاء اللہ پھر حاصل ہوگا۔ انتظامی صلاحیت سب میں نہیں ہوتی، خدا نے آپ کو وہ عطا کی ہے۔

خدا کرے آپ کی دوسری اننگ پہلے سے اور زیادہ بہتر ہو۔

■ آفاق احمد، گل کدہ، عید گاہ ہلز، بھوپال-462001

یہ نوید ملی کہ آپ نے قومی اردو کونسل میں اپنی منصبی ذمے داریوں کا چارج لے لیا ہے۔ میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیے۔ مجھے یقین ہے کہ کونسل کا قیام جن مقاصد کی تکمیل کے لیے ہوا ہے، ان میں حسب سابق پھر اسی دور کا آغاز ہوگا جو آپ کے دور کے نام سے جانا جاتا ہے۔

■ پروفیسر سید جعفر رضا، ''شبستان'' 786 شاہ گنج، الہ آباد-211003

حق بحقدار رسید کے مصداق قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دوبارہ ڈائرکٹر شپ پر دلی مبارک باد۔ مجھے خاصی تاخیر سے اطلاع ملی۔ ایک ضرورت سے محترمی ڈاکٹر کمال احمد صدیقی صاحب نے فون کیا تو یہ خوشخبری بھی دی۔

قومی کونسل میں آپ کے دوبارہ ڈائرکٹر کا عہدہ قبول کرنے میں یقیناً اردو کی خدمت کا جذبہ کارفرما ہے، ورنہ میں واقف ہوں کہ آپ اس کے لیے رضامند نہیں تھے۔ اب آ ہی گئے ہیں، تو اپنے قدیمی جوش و خروش سے سرگرم ہو جائیے۔

■ پروفیسر کرامت علی کرامت، رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک-753001 (اڑیسہ)

''اردو دنیا'' (جون 2009) سے یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ آپ نے پھر سے قومی کونسل برائے فروغ اردو کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھال لیا ہے۔ ہدیۂ تبریک پیش کر رہا ہوں۔ قبول فرمائیے۔

■ راشد جمال فاروقی C-1452، آئی ڈی پی ایل، ٹاؤن شپ ویربھدرہ، رشی کیش، دہرہ دون-292002

''اردو دنیا'' جون، کا سرورق جیسے ہی پلٹا مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ پر نظر پڑی۔ جی خوش ہو گیا۔ آپ جیسے فعال، سرگرم اور اردو کے عاشق کو اس کی اصل جگہ پر پھر پا کر ہم اردو والے خدا کا شکر کرتے ہیں۔

■ حکیم غزالی انور ہلال سلفی، معرفت ڈاکٹر اے۔ اے۔ ہلال، نزد ملت کالج، محلہ بی بی پاکر، دربھنگہ-846004 (بہار)

یہ خبر میرے لیے اور تمام اردو دنیا کے لیے بہت مسرت کی ہے کہ آپ نے پھر سے قومی کونسل کے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھال لیا ہے۔ اس کے لیے میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں، قبول فرمائیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے اس عہدے پر سرفراز ہونے سے کونسل پھر سے پہلے کی طرح سرگرم و فعال ہو جائے گی۔

■ مہتاب حسین انصاری، ایس۔ پی۔ ایجوکیشن سینٹر، جونیئر ہائی اسکول بابو پوروا، کانپور، یوپی-1301413

گذشتہ دنوں اخبارات سے معلوم ہوا کہ آپ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کا عہدہ پھر سنبھال لیا ہے۔ دوسری بار ڈائرکٹر کے عہدے سے سرفراز ہونے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یہ خبر پوری اردو دنیا کے لیے باعث مسرت ہے۔

■ محمد فرید خاں، سکریٹری قاسمی ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، بھوپال

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر کا عہدہ دوبارہ سنبھالنے پر ہماری سوسائٹی اور اس کے تمام ارکان کی طرف سے آپ کو دلی مبارکباد۔ آپ نے اس منصب پر فائز ہونے کے بعد اردو کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ مابعد آزادی وطن، تاریخ اردو کا سنہرا باب ہے۔ آپ نے اردو کو ٹیکنالوجی سے جوڑ کر ملک بھر میں کمپیوٹر سینٹر کھولے اور ان کو فعال بنایا اور اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب جس کی ترجمان اردو زبان ہے، اس کی ترقی کا سہرا آپ کے سر ہے۔

■ عبدالحکیم کھٹانہ، نیشنل ابراہیم میموریل ویلفیر سوسائٹی، قاسم نگر تحصیل مندھر، پونچھ، جموں و کشمیر-185211

نیشنل ابراہیم میموریل ویلفیر سوسائٹی مینڈر پونچھ (جموں و کشمیر) کی انتظامیہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے آپ کی دوبارہ تعیناتی کو حکومت ہند کا ایک خوش آئند قدم قرار دیتی ہے۔ آپ ایک اچھے منتظم اور ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ امید ہے کہ اردو کونسل آپ کے زیر اہتمام اردو کی ترقی کے لیے نئی سرگرمیاں شروع کرے گی۔

■ **محمد رفیع الدین مجاہد معرفت مدینہ کیرانہ شاپ، مظفر نگر، آکولہ**

جون 2009 کا شمارہ اردو دنیا کو سمیٹنے کی سعی کرتا نظر نواز ہوا۔ بے شک رسالہ بہتر سے بہترین کی سمت گامزن ہے اور اس پر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کا دوبارہ تقرر سونے پر سہاگے کا کام کر رہا ہے۔ زیر نظر شمارے میں ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی اور محمد رفیع انصاری کے مضامین انتہائی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ حالاں کہ اس طرح کے مضامین خشک ہوا کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ دونوں حضرات لکھنے کا ہنر جانتے ہیں لہٰذا مضامین کو خشک نہیں ہونے دیا۔ ممتاز عالم رضوی نے شوکت حیات سے بڑی پیاری ملاقات کروائی ہے۔ خدا شوکت حیات کو نہیں تو کم از کم ان کے ادبی کارناموں کو عمر خضر عطا فرمائے۔

■ **عطا عابدی، فقیرہ خان (اردو بازار)، دربھنگہ -846004 (بہار)**

سب سے پہلے مبارکباد قبول کیجیے کہ اللہ نے آپ کو ایک بار پھر فروغ اردو زبان کی غیر معمولی ذمے داری دی۔ خدا آپ کو اس ذمے داری کو بہتر سے بہتر طور پر ادا کرنے کی توفیق دے۔

''اردو دنیا'' (جولائی 2009) مطالعے میں آیا۔ حسب روایت اردو زبان و ادب کے مختلف و متنوع پہلوؤں کا احاطہ زیر نظر شمارے کے مشمولات سے ہوتا ہے۔ محمد مشاہد کا مضمون ''گلوبلائزیشن اور اردو'' او رحلیمہ فردوس کا مضمون ''ریاست کرناٹک میں اردو ذریعۂ تعلیم'' خاص طور پر توجہ طلب ہیں۔

محمد مشاہد کے مضمون کی یہ باتیں ملاحظہ کریں

☆ایک محتاط اندازے کے مطابق اکیسویں صدی میں دنیا کی 90 فیصد زبانیں اور بولیاں معدوم ہو سکتی ہیں۔

☆اقوام متحدہ کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ 2500 سے زیادہ زبانیں اور بولیاں اپنا وجود کھونے والی ہیں۔

☆ ماہر لسانیات اروند کے مطابق: ''آج دنیا میں 6500-6800 زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں ان میں زیادہ تر زبانیں اپنا وجود کھونے والی ہیں کیوں کہ ہر دو ہفتے میں ایک زبان ختم ہو رہی ہے۔ اس طرح درجنوں ہندوستانی زبانیں مستقبل میں اپنا وجود کھو دیں گی۔''

☆ نرائن کمیشن کے مطابق 3450 زبانیں اپنا وجود کھونے والی ہیں۔

☆ معروف ماہر لسانیات اینڈ ریوڈلی کا کہنا ہے کہ دنیا میں الگ الگ اسباب سے کچھ زبانوں کی بالادستی قائم ہو رہی ہے جس کی وجہ سے کچھ زبانیں سمٹ کر تاریکی میں جا رہی ہیں۔

حلیمہ فردوس نے بھی اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ''ماہرین لسانیات نے عالمی سطح پر بیسویں صدی کو زبانوں کے زوال کی صدی قرار دیا ہے۔''

یہ باتیں تشویشناک بھی ہیں اور توجہ طلب بھی۔ اس کی تحقیق و تفتیش ہونی چاہیے کہ آخر وہ کون کون سی زبانیں ہیں جو حالیہ چند برسوں میں رو بہ زوال یا معدوم ہوئیں۔ نیز یہ کہ ان زبانوں کے رو بہ زوال ہونے یا معدوم ہونے کے اسباب و عوامل کیا تھے۔

اگر ان اسباب و عوامل کے چند اشارے بھی، خدانخواستہ اردو زبان کے ارد گرد نظر آ رہے ہوں تو ان کے سد باب کی صورتوں پر فوری عمل ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے، تحقیق و سد باب کا یہ کام اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے وسائل یافتہ اداروں کے ذریعے ہی بہتر طور پر انجام دیا جا سکتا ہے۔

ظہیر غازی پوری کے مضمون ''قصیدہ ایک فراموش شدہ صنف سخن'' میں قصیدے کے احیا کا جذبۂ صادق کارفرما ہے۔ مگر اب یہ صنف اپنی صورت یا جگہ بدل چکی ہے اور تبصرہ و تنقید یا تعارف کے دامن میں پناہ لے چکی ہے:

قصیدے کی نئی تعریف لکھو
تعارف اب قصیدہ ہو چکا ہے
(عطا عابدی)

ویسے شادی بیاہ کے مواقع پر لکھی جانے والی نظموں یا تہنیتی گلدستوں کو قصیدے کی صنف کے مماثل سمجھنا چاہیے۔ قصیدہ ایک خاص سماج کی پیداوار تھی۔ ایسے میں اس صنف کے احیا کی کوشش مخلصانہ ہونے کے باوجود کامیابی کے امکانات نہیں رکھتی۔

■ **افضل بیگ، مسلم لائبریری (رجسٹرڈ) بنگلور-1**

ہمیں ماہنامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' بڑی ہی پابندی سے ملتا ہے۔ بہت ممنون ہیں ہم آپ کے۔ دونوں رسائل نہایت دلچسپ ہوتے ہیں، اردو دنیا کے چاند اور سورج ہیں۔ کیا مضامین، کیا فیچر، کیا تبصرے ہر ایک چیز معیاری معلومات کا خزانہ لیے ہوئے ہوتی ہے۔ یہ بڑی خدمت ہے جو آپ کر رہے ہیں۔ ہماری لائبریری میں یہ رسائل حد سے زیادہ مقبول ہیں اور ہم ان کا ہر شمارہ محفوظ کر لیتے ہیں اور سال کے آخر میں جلد بنوا لیتے ہیں۔

■ **فردوس بانو، لوکو کالونی، مغل سرائے، چندولی، یو۔پی۔**

ماہنامہ ''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ آپ کا رسالہ ہم طلبہ اور طالبات کے ذہنی معیار کو بلند کرنے اور ادب فہمی میں نہایت معاون ثابت ہوتا ہے۔ رسالے کے تمام مضامین بے حد معلوماتی اور اہم ہیں۔ زبان کے سلسلے میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ابن کنول صاحب کے مضمون کو پڑھ کر دہلی یونیورسٹی میں نہ پڑھ پانے پر محرومی کا احساس ہوا۔ محمد رفیع انصاری نے ''آب حیات'' پر جو قلم فرسائی کی ہے وہ نہایت دلچسپ ہے۔ ظہیر احمد صدیقی فانی کی شاعری کی اہمیت و افادیت اور ان کی شاعرانہ شخصیت کو نمایاں کرنے میں کامیاب ہیں۔

■ **مشتاق احمد، کپواڑہ، کشمیر-193222**

''فکر و تحقیق'' کے اپریل تا جون شمارے میں حرف اول میں عربی فارسی کو اردو کی شناسائی میں سنگ میل قرار دیا گیا۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ ان دونوں زبانوں سے واقفیت اردو داں طبقے کے لیے ضروری ہے۔ نیز ہندی سے بھی واقفیت، میں ضروری سمجھتا ہوں کیوں کہ ہندی اور اردو کا رشتہ بہت ہی مضبوط ہے۔ امید ہے کہ اردو داں طبقہ ان تینوں زبانوں کو سیکھنے کی کوشش کرے گا۔

■ **سلطان احمد، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ**

مئی 2009 کے اداریے میں اردو رسم الخط سیکھنے کے تعلق سے مفید مشورے پیش کیے گئے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ آج کون سی اردو زندہ ہے؟ میرا مشاہدہ ہے کہ اردو کا اسلامی کرن ہو چکا ہے۔ اردو کا ہر اخبار اور رسالہ (چند کو چھوڑ کر) کچھ مخصوص موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ مسلم پرسنل لا، مسلم یونیورسٹی، امریکا اور عراق فتوے، یہی سب پڑھنے کے لیے ہمارے بچے اردو سیکھیں گے؟ سچ تو یہ ہے کہ اردو ادب چند ڈاکٹر نما لوگوں تک محدود ہے۔ وہی لکھتے ہیں اور وہی پڑھتے ہیں۔ باقی مولانا قسم کے لوگ ہیں جن کو چار بیویوں اور تین طلاق میں دلچسپی ہے۔ لہٰذا وہ عورت، پردہ، نکاح، طلاق، چندے کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

■ **ڈاکٹر ایس کے جبیں، ڈین، شعبۂ ہیومانٹیز، صدر شعبۂ اردو و فارسی، ویر کنور سنگھ یونیورسٹی، آرہ (بہار)**

''اردو دنیا'' کا شمارۂ جون پڑھا۔ آپ ''اردو دنیا'' کو پروقار بنانے میں جتنی عرق ریزی کر رہے ہیں، لائق تحسین ہے۔

اداریہ ''ہماری بات'' میں پندرھویں لوک سبھا کے انتخابی نتائج کے پیش نظر کہی گئی باتیں آپ کی سیاسی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔ آپ کا یہ قول ''کہیں مذہب و ثقافت کے نام پر تو کہیں ذات پات اور زبانوں کے حوالے سے سیاسی مفادات حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، سیاسی قسمت آزماؤں کی نظر عام طور پر قومی اور ملی مفادات سے زیادہ نجی مفادات پر مرکوز رہتی ہے۔ پندرھویں لوک سبھا کے انتخابی نتائج نے اس ذہنیت کی حوصلہ شکنی کی ہے اور یہ ملک و قوم کے مفاد میں نیک شگون ہے۔'' صد فی صد صحیح ہے۔

''اردو دنیا'' کے اس شمارے میں شامل مضامین خصوصی طور پر وہاب قیصر، کے.صلاح الدین، اقبال محی الدین، جاوید کامٹوی، ابن کنول، فیروز احمد، غازی علم الدین، عطا عابدی، پردیپ جین، یوسف کمال اور ظہیر الدین کے مضامین تحقیقی اور معلوماتی ہیں۔ ممتاز عالم رضوی کا شوکت حیات سے ایک ملاقات ان کے نظریات اور ادبی زندگی کے پس منظر کو جاننے کے لیے سودمند ہے۔ میری طرف سے سبھی قلم کاروں کو نیک خواہشات۔

■ **قاسم بن ظہیر، 1658، آواس وکاس کالونی، بلند شہر روڈ، ہاپوڑ**

مئی 2009 کا شمارہ حسب سابق صوری و معنوی اعتبار سے خوب ہے۔ ''ہماری بات'' کے تحت آپ نے رالف رسل کے طویل مضمون کا اقتباس پیش کیا ہے۔ یہ مضمون ارباب اردو کو آئینہ دکھاتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اہل اردو ہی اردو کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ اپنے بچوں کو اردو سے نابلد رکھنا اردو دشمنی کے سوا اور کیا ہے؟

علی احمد فاطمی کا مقالہ ''الٰہ آباد کا ادبی ماحول: منظر اور پس منظر'' ادبی اور تاریخی علم میں اضافہ کرتا ہے۔ الٰہ آباد کی اپنی ایک الگ ادبی اہمیت ہے، یہ ایک علمی تحقیق ہے جس کے لیے فاضل مقالہ نگار مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد کا مضمون ''تنقید کا منصب'' بھی طلبہ کے لیے اس شمارے کا ایک اچھا مضمون قرار دیا جائے گا۔ معید رشیدی نے وحشت کی غزل اور ان کے نظریۂ فن کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ بلاکسی تردد کے وحشت کو غزل کے معماروں کی صف میں کھڑا کیا جا سکتا ہے، وحشت نے غزل کی اس پرآشوب دور میں حمایت کی جب ہر چہار جانب سے غزل پر تنقید و تنقیص کے تیر برس رہے تھے۔

ان کے علاوہ بھی تمام مشمولات خوب ہیں۔ اگر آپ جدید تخلیقات میں سے افسانہ، غزل وغیرہ شامل اشاعت کرلیا کریں تو بہتر ہوگا ورنہ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔

■ **ڈاکٹر محمد ناظم علی، صدر شعبۂ اردو، گری راج کالج، نظام آباد-503002**

''اردو دنیا'' جون 2009 کا شمارہ ہدست ہوا۔ سرورق پر ڈاکٹر منموہن سنگھ وزیر اعظم ہندوستان اور پیچھے پارلیمنٹ کو دکھایا گیا ہے۔ ''ہماری بات'' میں ہندوستان کی رنگارنگی، ہمہ رنگی کو قومی یک جہتی کی اساس بتایا گیا ہے۔ حالیہ الیکشن میں رائے دہندوں نے فرقہ پرست طاقتوں کو مسترد کردیا اور سیکولر کلچر کے فروغ کے لیے کانگریس کو برسراقتدار لائے۔ نئی حکومت سے بہتر توقعات وابستہ ہیں۔ زبان و تعلیم کے تحت جو مضامین شائع ہوئے ہیں وہ معلومات سے پُر ہیں۔ اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم کے موقف کو وہاب قیصر نے مفصل لکھا ہے۔ MANUU میں PG سطح پر تمام مضامین اردو میں لکھنے کی سہولت ہے لیکن عثمانیہ یونیورسٹی میں PG کے مضامین کے جوابات انگلش میں لکھنا ہوتے ہیں۔ کاش وہاں بھی PG کے مضامین کے جوابات اردو میں لکھنے کے احکام صادر ہوں تو اردو کے لیے یہ عمل خوش آئند ہوگا۔ باقی مشمولات بھی فکر انگیز ہونے کے ساتھ معلومات افزا ہیں۔ ''اردو دنیا'' کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رسالہ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے اور اپنے قارئین کو عصر میں جینے کا سلیقہ سکھاتا ہے نیز عصری شعور و آگہی عطا کرتا ہے۔

■ ایم راٹھور، اڈ نائیڈو، ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑہ، مدھیہ پردیش

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ ہمیشہ کی طرح ایک نئی آن بان کے ساتھ دستیاب ہوا۔ اس رسالے کے مشمولات فکر آمیز ہوتے ہیں۔ اس میں مختلف موضوعات پر جو مضامین شائع ہوتے ہیں ان سے قارئین کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ ''ہماری بات'' کے تحت اداریے میں جن مسائل کی طرف قارئین کی توجہ دلائی گئی ہے وہ لمحۂ فکریہ عطا کرتے ہیں۔ ''اردو میڈیم میں اعلیٰ تعلیم'' وہاب قیصر کا غور طلب مضمون ہے۔ ''اردو میں مستعمل عربی الفاظ'' بھی پسند آیا۔ اردو زبان نے اپنے دامن کی کشادگی کا ثبوت دیتے ہوئے علمی، ادبی، معاشی اور فنی موضوعات پر عربی کے خوبصورت الفاظ کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ اردو زبان ارتقا کے کئی مراحل طے کرتے ہوئے تبدل کی منزلوں سے گزری ہے اور اس سفر میں اس نے دوسری زبانوں سے رشتہ قائم کیا ہے، فارسی سے اس کے رشتے کی پہلی بنیاد رسم الخط ہے۔ اردو کے دیگر زبانوں سے رشتے ان زبانوں کی خصوصیات کو اپنانے کی ہنرمندی ظاہر کرتے ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان کے کلچر میں پہلی سطح پر کوئی فرق آج بھی نہیں ہے۔ اس رشتے کو مضبوط تر بنانے میں اردو زبان کا بہت بڑا دخل ہے۔ مسائل دونوں طرف ایک سے ہیں، شدت کا فرق ضرور ہے۔ ہم ایک دوسرے کے قریب آئیں گے تو ان مسائل کا بہتر حل نکال سکیں گے۔

''اردو خبرنامہ'' معلومات سے بھرپور ہوتا ہے جو ہمیں اردو دنیا کی تمام سرگرمیوں سے متعارف کراتا ہے۔

■ سرور ساجد، نظیر خان لین، مین روڈ۔ رانچی-1 (جھارکھنڈ)

جولائی 2009 کا ''اردو دنیا'' نظر نواز ہوا۔ رسالہ نہ صرف اپنے سابقہ معیار کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہے بلکہ روز بہ روز اس میں نئے، معنی خیز اور مفید مطلب موضوعات کی شمولیت اس کی مقبولیت میں اضافے کا باعث ہے۔ موجودہ شمارے میں یوں تو کئی مضامین اہمیت کے حامل ہیں لیکن خصوصی طور پر عبدالعلیم قدوائی کا مضمون ''ہندوستان میں ابتدائی یا پرائمری تعلیم'' اور رحلیمہ فردوس کا ''ریاست کرناٹک میں اردو ذریعۂ تعلیم'' اس لیے زیادہ پسند آئے کہ ان دونوں مضامین میں اردو کے بنیادی مسائل اٹھائے گئے ہیں جو ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں کہ ہم اردو کو ابتدائی یا پرائمری سطح پر ذریعۂ تعلیم کے طور پر کس طرح زیادہ موثر بنا سکتے ہیں۔ کیونکہ اردو کے ساتھ جو رویہ اپنایا جا رہا ہے وہ جڑ کاٹ کے پتوں پر چھڑکاؤ کے مماثل ہے اس لیے اردو کے بیدار مغز حضرات پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس مسئلے پر نہ صرف گہری نظر رکھیں بلکہ اس کے تمام گوشوں کو تحریر و تقریر میں نشان زد کریں تاکہ اس مسئلے سے پوری اردو دنیا واقف ہو اور اردو والے اپنی اپنی سطح سے اپنی بساط بھر تدارک کرنے کی کوشش کر سکیں۔

□□□

ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاصِ وطن کی لڑائی پورے جوش و خروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت -/300 روپے

تاریخ اور سماجیات

مصنفہ: عائشہ بیگم

تاریخ اور سماجیات، علم کے دو مختلف گوشے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تاریخ کا سب سے قریبی تعلق سماجیات سے ہے کیونکہ دونوں کا موضوع انسان، اس کا طرزِ عمل اور کردار ہیں۔ انسانی کردار کی داستان اس کے اخلاق و عمل اور آپسی تعلقات کی داستان ہے اور اخلاق و عمل کا انحصار بڑی حد تک ماضی کے تجربات پر بھی ہوتا ہے --- اس کتاب میں اس بحث کو بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔ طرزِ بیان استدلالی اور علمی ہے۔

صفحات: 140، قیمت -/51 روپے

ہماری بات

پچھلے چند برسوں میں الیکٹرانک میڈیا نے جس طرح فروغ پایا ہے اس نے کچھ لوگوں کو اس اندیشے میں مبتلا کر دیا کہ یہ پرنٹ میڈیا کے خاتمے کا اعلان ہے۔ شروع شروع ایسا محسوس ہوا کہ یہ اندیشہ بے بنیاد نہیں ہے کیونکہ لوگ اخباروں اور کتابوں کے مطالعے سے زیادہ ٹی.وی. وغیرہ کے پروگرام دیکھنے میں دل چسپی لینے لگے تھے۔ لیکن دھیرے دھیرے اندازہ ہونے لگا کہ یہ پروگرام کتنے بھی پرکشش کیوں نہ ہوں، مطالعے کا نعم البدل تو کیا بدل بھی مہیا نہیں کر سکتے۔ سیلولائڈ اسکرین پر آپ جو کچھ بھی دیکھتے ہیں وہ اگلے ہی لمحے ہوا میں تحلیل ہو جاتا ہے اور آپ کے ذہن پر کوئی پائدار نقش نہیں چھوڑتا۔ اس کے برعکس کاغذ پر چھپے ہوئے الفاظ پر جب آپ نظر ڈالتے ہیں تو وہ آپ کے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں اور آپ کی یادداشت کا حصہ بن جاتے ہیں۔

یہ انسانی یادداشت ہی ہے جسے تاریخ کی جنم داتا کہا جاسکتا ہے اور یہ تاریخ کے صفحات پر درج ہزاروں سال کے انسانی تجربات ہی ہیں جو مختلف علوم وفنون کی ایجاد اور ان کے فروغ کا باعث بنے ہیں۔ سماجی، سیاسی، اقتصادی، تمدنی، تہذیبی، معاشرتی، عمرانی غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں جو سرگرمیاں آج دیکھنے میں آرہی ہیں، ان سب کے پیچھے تحریر شدہ الفاظ کی جادوگری کارفرما ہے۔ مذہب اور سائنس کا وسیلۂ اظہار بھی الفاظ ہی ہیں۔ جتنی آسمانی کتابیں انسان پر نازل ہوئی ہیں وہ الفاظ کا مجموعہ ہیں اور جتنے سائنسی انکشافات ہوئے ہیں، ان تک بھی الفاظ یا ان سے وابستہ علامات کے ذریعے ہی انسانی ذہن کی رسائی ہوئی ہے۔ یعنی ہماری روحانی زندگی ہو یا مادّی زندگی، دونوں کی اساس کاغذ پر چھپے ہوئے لفظ ہی ہیں۔ جتنے احساسات انسانی دل و دماغ میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، ان سب کو گویائی عطا کرنے والے وہ الفاظ ہی ہیں جو ہماری نوکِ قلم پر آکر کتابوں کے صفحات پر جگہ پاتے ہیں اور امر ہو جاتے ہیں۔

گذشتہ صدی کے نصف اوّل تک ہمارے پڑھے لکھے خاندانوں کے اکثر گھروں میں ایک چھوٹی موٹی لائبریری ضرور ہوا کرتی تھی جس میں مختلف موضوعات پر کتابیں جمع کرنے کی لگن لوگوں میں پائی جاتی تھی۔ بعض گھروں میں جہاں گنجائش تھی، بڑی لائبریریاں بھی ہوا کرتی تھیں جن سے گھر والوں کے علاوہ پاس پڑوس کے لوگ بھی استفادہ کر سکتے تھے۔ علم و ادب کا ذوق رکھنے والے بعض صاحب ثروت لوگوں یا والیان ریاست نے مختلف علوم وفنون کی کتابوں کے اتنے بڑے ذخیرے فراہم کیے کہ آج انھیں قومی کتب خانوں کی حیثیت حاصل ہے، جیسے حیدرآباد کے سالار جنگ میوزیم کا کتب خانہ، پٹنہ کی خدابخش لائبریری، رامپور کی رضالائبریری اور ٹونک کی مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری۔ بدلے ہوئے حالات کے زیر اثر کتابیں جمع کرنے کا یہ ذوق وشوق باقی نہیں رہا اور کتب بینی کی عادت بھی کم ہوتی جارہی ہے۔ قومی اردو کونسل نے اس صورت حال کا نوٹس لیتے ہوئے اور اس میں تبدیلی لانے کے لیے کچھ سال پہلے ملک بھر میں اردو کتاب میلے منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور مختلف شہروں میں جہاں اردو آبادی قابلِ لحاظ تعداد میں موجود تھی اردو کتاب میلوں کا اہتمام کیا۔ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا اور ان میلوں میں ہزاروں کی نہیں لاکھوں کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ اس تجربے سے اندازہ ہوا کہ اردو کتابوں کے شائقین تو موجود ہیں لیکن ڈاک خرچ کی بڑھی ہوئی شرحوں اور کچھ دوسری پریشانیوں کی وجہ سے وہ اپنی پسند کی کتابیں خریدنے سے خود کو قاصر پاتے ہیں۔ جب یہ کتابیں انھیں بہ آسانی دستیاب کرائی گئیں تو انھوں نے فراخ دلی سے ان کی خریداری کی۔

اب قومی اردو کونسل نے اس سمت میں ایک اور مثبت قدم اٹھاتے ہوئے موبائل وین کے ذریعے آپ کی پسند کی کتابیں آپ تک پہنچانے کا اہتمام کیا ہے۔ کونسل کی اس موبائل وین کو 25 جون کو فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر اور قومی اردو کونسل کے چیئرمین جناب کپل سبل صاحب نے ہری جھنڈی دکھا کر اتر پردیش کے لیے روانہ کیا۔ یہ موبائل وین اب تک اتر پردیش کے کئی اضلاع میں جاچکی ہے جہاں اس کا پرجوش خیرمقدم کیا گیا ہے اور علم وادب کے شائقین بڑی تعداد میں کتابیں خرید رہے ہیں۔

اتر پردیش کے بعد قومی اردو کونسل کی یہ موبائل وین ملک کے دوسرے صوبوں میں بھی جائے گی اور اس کا یہ سفر شہر بہ شہر جاری رہے گا۔

•

اس مہینے سے ''اردو دنیا'' میں کلاسیکی ادب کے لیے کچھ صفحے مخصوص کیے جارہے ہیں، امید ہے کہ قارئین اس سلسلے کو پسند کریں گے۔

□□□

عبدالغنی شیخ

ہمارا نظام تعلیم ـــــ اصلاح کا متقاضی

آئے دن تعلیمی حالات کے جو سروے ہوتے ہیں ان میں سرکاری اسکولوں کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے۔ ایک حالیہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پانچ ریاستوں کے دیہی اسکولوں میں پانچویں جماعت کے طلبہ پڑھنے میں دوسری جماعت کے معیار پر بھی پورے نہیں اترتے۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق دیہی علاقوں میں پرائمری اسکولوں میں چار میں سے ایک استاد غیر حاضر رہتا ہے۔ دو میں سے ایک نہیں پڑھاتا ہے۔

رپورٹوں کے مطابق پرائمری جماعتوں میں 95 فیصد سے زیادہ بچے پاس ہوجاتے ہیں لیکن بورڈ کے امتحان میں پاس ہونے کی شرح 64 فیصد سے آگے نہیں بڑھتی۔

ایک غیر سرکاری تنظیم پرتھم کے 2007 کے سروے کے مطابق تیسری سے پانچویں جماعت تک صرف 66 فیصد طلبہ اپنی مادری زبان میں پڑھ سکتے ہیں۔ 60 فیصد نے ریاضی کے بنیادی فارمولے سیکھے ہیں۔ جبکہ سترہ فیصد طلبہ پہلی جماعت کی سطح کی بھی انگریزی درسی کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔

دو سال پہلے ورلڈ بینک ڈیولپمنٹ پالیسی ریویو میں بتایا گیا تھا کہ اکثر ریاستوں میں پرائمری اسکولوں میں پچاس فیصد سے کم استاد حاضر تھے۔ حتیٰ کہ کیرالا جیسی تعلیمی ریاست میں بھی اساتذہ کی غیر حاضری کی شرح چالیس فیصد تھی۔

لگ بھگ ڈیڑھ سال پہلے کی ایک رپورٹ کے مطابق ملک کے پرائمری اسکولوں کے 47 لاکھ استادوں میں بہت کم تربیت یافتہ استاد تھے۔ تقریباً آدھی تعداد ایسے استادوں کی تھی جن کی تعلیمی ڈگری بارھویں جماعت سے زیادہ نہیں تھی۔ ملک کے چار لاکھ پرائمری اسکولوں میں بہت سارے اسکولوں میں پڑھائی کے کمرے اور بیت الخلا نہیں ہیں۔ ورلڈ بینک نے 43 ملکوں کے چھ ہزار طلبہ کا ریاضی اور سائنس میں امتحان لیا۔ اس امتحان میں ہندوستان کی دو ریاستوں راجستھان اور اڑیسہ کے پرائیویٹ اور سرکاری اسکولوں کے طلبہ نے حصہ لیا۔ رپورٹ کے مطابق ہمارے بہترین اسکولوں کی چوتھی جماعت کے طلبہ نے اکثر ملکوں کی تیسری جماعت کے طلبہ سے کم نمبر حاصل کیے۔ اس امتحان میں سنگاپور اول اور جنوبی کوریا دوئم آیا۔

سرکاری اسکولوں میں تعلیمی معیار پست ہونے کی وجہ سے بہت سارے لوگ پرائیویٹ اسکولوں پر تکیہ رکھتے ہیں چنانچہ ایک سروے کے مطابق شہری علاقوں میں اوسطاً 53 فیصد بچے پرائیویٹ اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ کئی ریاستوں میں یہ شرح اس سے زیادہ ہے۔ سرکاری اسکولوں میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد میں بتدریج کمی آرہی ہے۔ سماج کے کمزور طبقوں کے بچے ہی ان اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ ورلڈ بینک ڈیولپمنٹ پالیسی ریویو کے مطابق آٹھ بڑی ریاستوں کے شہری علاقوں میں پچاس فیصد سے زیادہ طلبہ بنیادی تعلیم کے لیے پرائیویٹ اسکولوں پر انحصار رکھتے ہیں۔

لداخ کے لیہہ ضلع میں تقریباً تین سو سرکاری اسکول ہیں جبکہ پرائیویٹ اسکولوں کی تعداد 49 ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ ضلع کے بیس ہزار طلبہ میں نصف سے زیادہ طلبہ ان 49 پرائیویٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

مدھیہ پردیش میں جب ڈگ وجے سنگھ وزیر اعلیٰ تھے تو انھوں نے تعلیم کے شعبے میں کچھ اصلاحات کی تھیں اور پنچایتوں کی تعلیمی کمیٹی کو حکم دیا تھا کہ وہ قصوروار استادوں کی تنخواہ کاٹ لیا کریں۔ ڈگ وجے سنگھ اگلا چناؤ ہار گئے تھے۔ انھوں نے ایک ماہر تعلیم کے سامنے یہ اعتراف کیا کہ ان کی ہار کی ایک وجہ استادوں کی مضبوط یونین تھی، جس نے ان کی اصلاحات کی مخالفت میں ان کو چناؤ میں شکست دینے کی بات کہی تھی۔

بہت سے طلبہ امتحان یا پڑھائی سے گھبرا کر گھر سے فرار ہوتے ہیں بعض خودکشی کرلیتے ہیں۔ 2006 میں 5857 طالب علموں نے خودکشی کی تھی۔ اس کے پس پشت ہمارا ناقص نظام تعلیم ہے۔ کچھ لوگ استادوں کو ذمے دار قرار دیتے ہیں۔ خودکشی کرنے والے ایک طالب علم نے لکھا تھا کہ وہ بھوت بن کر آئے گا اور استاد کو ہراساں کرے گا۔

سارے سرکاری اسکولوں میں اندھیرا ہی اندھیرا نہیں، کہیں کہیں اجالا بھی ہے۔ اس اندھیرے میں دہلی سرکار کے اسکولوں نے امید کی کرن دکھائی ہے۔ پچھلے چار سال سے دہلی کے سرکاری اسکولوں نے بورڈ کی بارھویں جماعت کے امتحانات میں بتدریج بہت اچھے نتائج دکھائے ہیں اور طلبہ کی کامیابی کے تناسب میں گیارہ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ اس سال ان اسکولوں میں 89 اعشاریہ 47 فیصد طلبہ پاس ہوئے ہیں جبکہ پرائیویٹ اسکولوں کے نتائج 76 اعشاریہ 45 فیصد تھے۔ سرکاری اسکول کا ایک طالب علم انوج گوئل 96 اعشاریہ 6 فیصد نمبر حاصل کرکے ملک گیر سطح پر اول آیا اور 24 طلبہ کو امتیازی سندیں ملیں۔

دہلی کے ریاستی وزیر تعلیم اروند سنگھ لولی نے کہا ہے کہ وسائل کی کمی اور طلبہ کی روز افزوں تعداد کے باوجود تعلیمی معیار بلند ہوا ہے اور حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ اس ضمن میں کئی اقدام کیے گئے۔ ان میں قابلیت کی اساس پر استادوں کی تبدیلی اور ترغیبات شامل ہیں تاکہ ہر ایک سنجیدگی سے اپنا فرض منصبی سرانجام دے۔ وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت نے کہا کہ نتائج سے وہ خوش ہیں تاہم کوششیں جاری رہنی چاہئیں۔

لیکن ماہرین کی نظر میں ہمارے نظام تعلیم میں بنیادی خامی یہ ہے کہ Knowledge یا حصول علم پر دھیان نہیں دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہم دوسرے ملکوں کے مقابلے میں تعلیمی طور پسماندہ ہیں۔

اسکولوں کے نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے انگریزی کے ایک کثیر الاشاعت اخبار نے یہ سرخی جمائی تھی: Most Students Pass, Few actually learn

اکثر طلبہ پاس ہوئے ہیں لیکن چند نے علم سیکھا ہے۔ ایک اور اخبار نے لکھا ہے: ''ہم علم سے آراستہ نوجوانوں کے بجائے صرف خواندہ پودا پیدا کر رہے ہیں۔'' اس ضمن میں ایک انگریز اسکالر نے ایک جملے میں یوں اپنے تاثرات ظاہر کیے ہیں: ''ہندوستان ان پڑھ گریجویٹ پیدا کرتا ہے۔'' حالیہ برسوں میں بورڈ کے امتحانات میں زیادہ نمبر دینے کے رجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے انگریزی کے مذکورہ کثیر الاشاعت اخبار نے یہ سرخی دی ہے:

"Marks mask incompetence"

''نمبر نااہلی کو چھپاتے ہیں''

ڈیڑھ سال پہلے یونیسکو نے 127 ملکوں کی تعلیمی رپورٹ میں ہندوستان کو تعلیمی معیار کے لحاظ سے آخری پندرہ ملکوں کی صف میں رکھا ہے۔

عالمی پیمانے کے مطابق دنیا کی دو سو چھبیس بہترین یونیورسٹیوں میں ہماری ایک بھی یونیورسٹی شامل نہیں ہے۔ یہ دو سو میں چھبیس یونیورسٹیاں ایشیا میں ہیں جن میں 11 جاپان، 10 چین اور ایک اسرائیل میں ہے۔

ایک مغربی ماہر تعلیم نے ناقص نظام تعلیم پر چوٹ کرتے ہوئے کہا تھا:

''انسان بے وقوف پیدا نہیں ہوتا۔ تعلیم نے اس کو بے وقوف بنایا ہے۔''

متعدد کمیشنوں نے نظام تعلیم میں اصلاحات لانے کی سفارشات کی ہیں لیکن ان پر عمل نہیں ہوا ہے۔ ماہرین نے موجودہ نظام تعلیم کو Overhaul تبدیل کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

تعلیم کو Privatise کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ سویڈن میں 1990 کی شروعات سے تعلیم کو غیر مرکزی بنا کر میونسپلٹی کی تحویل میں دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق بچوں کو voucher یا چیک دیا جاتا ہے۔ جس سے اسکول کا نظام چلتا ہے۔ بچوں کی کارکردگی کی اساس پر استاد کو بونس دیا جاتا ہے۔ اس سے غریب طلبہ سرکاری خرچ پر اپنی پسند کے اسکول میں داخلہ لے سکتے ہیں اور اسکول براہِ راست والدین کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔ ماہرین تعلیم نے اس نظام کو ہندوستان میں مروّج کرنے کی سفارش کی ہے۔

امریکا میں Applied تعلیم پر زور دیا جاتا ہے اور پہلے دو سال Liberal art یعنی تاریخ، ادب، سیاسیات جیسے مضامین سبھی طلبہ کو پڑھائے جاتے ہیں چاہے کسی نے انجینئرنگ یا Management جیسے مضامین لیے ہوں۔ ماہرین نے عالمگیریت کے اس زمانے میں ہماری یونیورسٹیوں میں زیادہ مضامین کے درس و تدریس کی تجویز کی ہے۔ ماہرین تعلیم کا یہ بھی کہنا ہے کہ اعلیٰ تعلیم مستحق طلبہ تک محدود رکھی جائے اور جو طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لیے موزوں نہ ہوں، انھیں پیشہ ورانہ تعلیم دلائی جائے۔

□□□

پتہ:
"Yasmin" Fort Road,
Leeh, Laddakh-194101

اردو زبان کی تدریس

مصنف: معین الدین

اردو کیسے پڑھی اور پڑھائی جائے درس و تدریس کے جدید سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں تدریسی طریقہ کار کا تعین طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔ یہ کتاب طلبہ و اساتذہ کی انھی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔

پانچواں ایڈیشن

صفحات: 148، قیمت -/29 روپے

ڈاکٹر چمن آرا خان

زبان کی تدریس کے طریقۂ کار

زبان محض اظہار خیال کا وسیلہ ہی نہیں بلکہ یہ بہت سے علوم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ یہ ہمارے گردوپیش کی حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے۔ زبان کی تعلیم کا کوئی بندھا ٹکا اصول یا قاعدہ نہیں ہے۔ زبان کی تعلیم و تدریس کے لیے اصول لچک دار ہوتے ہیں۔ کیونکہ زبان کی تعلیم پر بہت سے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں، مثلاً سیکھنے کے عمل، حافظے، اخذ و قبول کی قوت، دماغی صلاحیت اور سماجی ماحول میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایسی صورت حال میں کسی ایک طریقے کو سب کے ساتھ آزمانا، زبان پڑھانے والے کے لیے خاصا مشکل ہوتا ہے۔

زبان سکھانے میں طریقۂ کار خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ زبان سکھانے کے کئی طریقے ہیں، جن پر کئی دہائیوں سے بحث ہوتی چلی آرہی ہے۔ ایک طریقۂ کار کو دوسرے پر فوقیت دی جاتی رہی ہے۔ مثلاً براہِ راست طریق کار (Direct Method)، فطری طریق کار (Natural Method)، نفسیاتی طریق کار (Psychological Method)، صوتی طریق کار (Phonetical Method)، قواعدی طریق کار (Grammatical Method) وغیرہ۔ ان تمام طریقوں کا بنیادی مقصد مواد کے انتخاب، مواد کی تقسیم اور اس کے پیش کرنے اور دہرانے کے عمل پر منحصر ہے۔ زبان کے اساتذہ ان طریقوں میں سے کسی ایک طریقے کو اختیار کرکے زبان سکھانے کا عمل شروع کرتے ہیں۔ اگر پڑھانے سے قبل استاد زبان کی تعلیم کے مقاصد کو پیش نظر رکھے تو اس کے لیے زبان سکھانا زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔

زبان کی تعلیم کے چار مقاصد ہیں۔ مثلاً سمجھنے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی مہارت۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان چاروں مقاصد کو کس طرح ترتیب دیا جائے؟ اس ضمن میں یہ طریقہ استعمال کیا جا سکتا ہے کہ پہلے طالب علم کو صرف بول چال کی زبان سمجھائی جائے۔ دوسرا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سمجھنے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کا کام ایک ساتھ شروع کرادیا جائے۔ آخر الذکر سب سے مناسب طریقہ ہے۔ کیونکہ زبان کے یہ سب پہلو ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔ جس زبان کو ہم پڑھ سکتے ہیں اسے صرف سمعی طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ اور جسے سن کر سمجھ سکتے ہیں اسے پڑھنا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سے لکھنے کی مشق کرنے سے پڑھنے کے کام میں بھی سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی کبھی زبان کے یہ مختلف پہلو ایک دوسرے کے کام میں رکاوٹ پیدا کر سکتے ہیں۔ کتاب کی زبان بول چال کی زبان سے قدرے مختلف ہوتی ہے تو طالب علم پریشان ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ اس کشمکش میں پڑ جاتا ہے کہ کتابی زبان کو بات چیت کے لیے استعمال کرے یا بول چال کی زبان کو تحریر میں لائے۔ ایسے میں استاد کا یہ فرض ہے کہ طلبہ کو کسی لفظ کے ادبی معنی اور بول چال کے معنی میں فرق کو واضح کرے اور جب ان کا استعمال کروائے تو وہ ایک دوسرے کے لیے یا اس کے برعکس استعمال کروائے۔ اس کے علاوہ طلبہ کو یہ بھی ذہن نشین کرادینا چاہیے کہ ہر لفظ جو وہ سنتا ہے بات چیت میں استعمال کے قابل نہیں ہوتا بلکہ موقعے کی مناسبت سے اس لفظ کو جملے میں استعمال کرنا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ اس قسم کا شعور طلبہ میں پیدا کرنا استاد کا کام ہے۔ زبان کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رکھنا بے حد ضروری ہے کہ زبان ہمیشہ ویسی ہی سکھائی جائے جیسی کہ وہ ہے نہ کہ جیسا اسے ہونا چاہیے۔

زبان کی تعلیم میں سب سے پہلے سماعت کے شعور کی تربیت ضروری ہے کیونکہ زبان کی امتیازی آوازوں کی ادائیگی سیکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ زبان سیکھنے والا ان آوازوں کو سن کر ان کی پہچان کر سکے اور ان سے بننے والے صوتی سلسلوں کے معنی کا فرق بھی سمجھ سکے۔ جب طالب علم جملوں کے معنی سمجھنے کے قابل ہو جائے تو بولنے کی مشق کرانی چاہیے۔ پڑھنے کا کام لکھنے سے شروع کرنے کے ساتھ جاری رکھنا چاہیے کیونکہ طالب علم جانے، پہچانے، جملوں اور ترکیبوں کے بجائے اپنے طور پر گھڑنے کی کوشش کرتا ہے تو لامحالہ اس میں غلطی کا امکان رہتا ہے۔ زبان کے تحریری پہلو میں مہارت پیدا کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ دوسرے کی تحریر کی نقل کرائی جائے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ طالب علم زبان سیکھنے کے معاملے میں اسی طرح حساس ہو جاتا ہے۔

زبان کے ادراکی پہلوؤں یعنی سمجھنے اور پڑھنے کے ساتھ اس کے عملی پہلوؤں یعنی بولنے اور لکھنے پر بھی دسترس ضروری ہے۔ جب طالب علم پڑھنے کے قابل ہو جائے، تب ہی اسے لکھنے کا کام دینا چاہیے مگر اس کا دار و مدار رسم الخط پر ہے۔ اگر رسم الخط حروف تہجی پر مبنی ہے اور زبان کی صوتیات سے مناسبت رکھتا ہے تو بولنے کے ساتھ پہلے سبق ہی سے تحریری پہلو پر بھی توجہ دی جاسکتی ہے۔

رسم الخط کو سکھانے کی شروعات پہلے اصوات کے ان نمائندہ حروف سے کرنی چاہیے جو دوسروں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ آسان ہوں۔ دوسرے اس

بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ زبان اس ماحول میں سکھائی جائے جہاں زبان بولی جاتی ہو، اگر یہ ممکن نہ ہو تو ایسی صورت میں وہ فضا اور ماحول، تصویروں، تحریروں، نقشوں اور خاکوں کی مدد سے کمرۂ جماعت میں پیدا کیا جاسکتا ہے۔ تلفظ اور لہجے پر کمال حاصل کرنے کے لیے بہرصورت اس طالب علم کو جو وہ زبان سیکھ رہا ہے اس کے رابطے میں رہنا پڑے گا۔ زبان سکھانے کے عمل میں اگر صوتی رسم الخط کو پیش نظر رکھا جائے تو غلطیوں کی بہت کم گنجائش رہتی ہے، ایسی صورت میں رسم خط بعد میں سکھایا جاتا ہے۔

زبان سیکھنے کا سب سے کارآمد جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ باقاعدہ مشق کرکے اس کی اہمیت پر زور دیا جائے کیونکہ مشق ہی سے مہارت پیدا ہوتی ہے۔ مشق کا کام خواہ کسی بھی مقصد سے کرایا جائے اس سے زبان کی بنیادی آوازوں کو پہچاننے اور انھیں صحیح تلفظ سے ادا کرنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ اس ضمن میں استاد کو اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ طالب علم ہر آواز کو صحیح طور پر سنے اور اسے صحیح طور پر ادا کرسکے۔ مشقوں کے ضمن میں ترجمے کی مشق کو جہاں تک ممکن ہو الگ رکھا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبانوں میں قطعی ہم معنی الفاظ بہت کم ملتے ہیں، اس لیے غلطی کا امکان رہتا ہے۔ اکثر طالب علم اپنی دانست میں جو لفظ استعمال کرتا ہے اس کو وہ ہم معنی سمجھ کر ترجمہ کرتا ہے۔ اب اس سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ جملہ نہ صرف اپنی ساخت بلکہ اصل معنی بھی کھو بیٹھتا ہے۔ ترجمہ اس وقت کامیاب ہوسکتا ہے جب متعلقہ زبانوں پر بھی برابر کا عبور حاصل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمے کو الگ مشق کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جو زبان سیکھنے والوں کے لیے بہت بعد کی منزل ہے۔ مشقوں کو تین بڑے حصوں میں اس طرح تقسیم کرسکتے ہیں: (1) بولنا اور لکھنا سکھانے کی مشق۔ (2) سننا اور پڑھنا سکھانے کی مشق (3) دہرانا اور ترجمہ کرانے کی مشق۔ مگر ان تمام مشقوں کے لیے استاد کو اپنی زبان پر عبور حاصل ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اسے پیشے سے متعلق جتنی زبانیں ہیں ان کے صحیح تلفظ، ساختوں پر گہری نظر اور نثر و شاعری کے اسلوب کی نزاکتوں سے واقفیت بھی ضروری ہے تاکہ وہ خود زبان کی ساخت کی پیچیدگیوں کو سمجھ کر ان مسئلوں پر بھی غور کرے جو زبان سکھاتے وقت اس کے سامنے آسکتے ہیں۔ لسانیات زبان اور اس کی بولیوں کے فرق کو سمجھنے میں خاصی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس علم کے بغیر زبان کی ابتدا اور ارتقا اور دوسری زبان سے اس کے رشتوں کو نہ تو سمجھا جاسکتا ہے نہ ہی سمجھایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ زبان کے استاد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ زبان اور دوسری قدروں کو طالب علموں تک پہنچا کر زبان کے مزاج کو بھی سمجھایا جاسکے۔ ایسے میں زبان بولنے والوں کے تہذیبی رشتوں سے بھی واقف ہو، تاکہ زبان کے عقائد، خیالات، نفسیات، روایات کے ساتھ استاد کا تجربہ کار ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ زبان پڑھانے میں ذاتی تجربوں کا خاصا دخل رہتا ہے۔ تدریس میں ذہنی، حسی اور جذباتی رفاقت کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ استاد اسی منزل سے اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے۔ ذہنی طور پر استاد کو بھی پڑھانے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

زبان سکھاتے وقت چاہے کوئی بھی طریقۂ کار اختیار کیا جائے لیکن اس میں دلچسپی کے عنصر کو بہرحال بڑھایا جانا چاہیے۔ زبان کو سکھانے اور ادبی ذوق کو پیدا کرنے کے لیے طلبہ کے درمیان تحریری، تقریری مقابلے، شعرخوانی، بیت بازی، مباحثے اور مضامین لکھوانے کی مشق ضرور کروانی چاہیے۔ دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لیے چند باتوں کو ذہن نشین کرلینا ضروری ہے۔ مثلاً ہر لفظ کی ساخت اور الفاظ کے استعمال کو سمجھانا، دوسرے ماحول کے مطابق قواعد سکھانا، بات چیت کے انداز کو فروغ دینا، تصویروں، خاکوں اور دیگر سمعی بصری آلات Audio Visual Aid کا استعمال کرنا۔ اس کے علاوہ سننے اور دہرانے کے عمل کو جاری رکھنا اور الفاظ کی بجائے جملوں سے شروعات کرنا یہ ایسے اصول ہیں جن سے زبان سیکھنے اور سکھانے کے عمل کو مزید دلچسپ بنایا جاسکتا ہے۔

□□□

105, Pratap Khand,
Vishwa Karma Nagar,
Vivek Vihar-II, Delhi-95

تحریکِ خلافت

مصنف: قاضی محمد عدیل عباسی

ہندوستان میں چلائی جانے والی تحریکِ خلافت نے بالواسطہ طور پر ہماری تحریکِ آزادی کو بھی ایک نئی قوت عطا کی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے جو اس تحریک میں شریک تھے، تحریک خلافت کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)، صفحات: 212، قیمت: -/65 روپے

مرتضیٰ علی اطہر

اعلیٰ تعلیمی نظام میں تبدیلی: وقت کی ضرورت

ہمارے ملک کے تعلیمی نظام بالخصوص اعلیٰ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت کو طویل عرصے سے محسوس کیا جارہا ہے لیکن اس سلسلے میں سنجیدہ کوششوں کا ہمیشہ فقدان رہا۔ گذشتہ کچھ برسوں سے صورت حال میں تبدیلی نظر آئی ہے۔ تعلیمی نظام میں تبدیلی کی ضرورت کے پیش نظر حکومت ہند نے فروری 2008 میں وزارت ترقی انسانی وسائل کے جاری کردہ نوٹیفیکیشن کی بنیاد پر ایک کمیٹی مندرجۂ ذیل دو مقاصد کی تکمیل کی غرض سے تشکیل دی۔ (الف) یو جی سی اور AICTE جو اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے ملک کے دو اہم تعلیمی ادارے (Regulatory bodies) ہیں، ان کی کارکردگی کا جائزہ لینا (ب) تعلیم تک عوام کی رسائی، ان کی حصے داری اور تعلیم کی بڑھتی ہوئی مانگ کو ادارہ جاتی قیادت دینے اور اعلیٰ تعلیم/تکنیکی تعلیم اور یونیورسٹی نظام کے معیار کو باریک بینی سے پرکھنے میں ان اداروں کے رول کا تجزیہ۔

ستمبر 2008 میں اس کمیٹی کا نام وسیع تر مقاصد کے پیش نظر تبدیل کرکے ''ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی تجدید اور احیا کے لیے مشاورت کمیٹی'' (Committee to advice on renovation and rejuvenation of Higher Education in India) کردیا گیا اور اس پر پورے اعلیٰ تعلیمی نظام کے تجزیے کی ذمے داری عائد کی گئی۔ اس 22 رکنی کمیٹی نے، جس کے چیئرمین یو جی سی کے سابق صدر پروفیسر یش پال ہیں، 24 جون کو اپنی رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ''اس بات میں شبہ نہیں کہ ہندوستان کا اعلیٰ تعلیمی نظام جس طرح کی لاتعداد پیچیدگیوں سے دوچار ہے، اس میں بڑی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ متعدد چھوٹے موٹے مسائل سے قطع نظر یونیورسٹی کے لیے ہمارا جو بنیادی تصور ہے اس کو ہی خطرہ لاحق ہے۔'' ہمارے ملک میں گذشتہ کچھ برسوں میں جس طرح سے نجی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا ہے خاص طور پر ڈیمڈ یونیورسٹیوں کو جس فراخ دلی سے منظوری دی گئی ہے اور ان کی تشخیص و تعین میں یو جی سی کا جو رول رہا ہے اس نے کمیٹی کو اس سلسلے میں سنجیدگی سے غوروفکر کرنے کا جواز فراہم کیا ہے۔ کمیٹی نے رپورٹ میں کہا ہے کہ ''یونیورسٹیوں کی اہمیت میں کمی، ان کی خودمختاری کا خاتمہ، علم کے مختلف شعبوں کے درمیان بڑھتا فاصلہ اور باہر کی حقیقی دنیا سے یونیورسٹیوں کی لاتعلقی وغیرہ بعض ایسے مسائل ہیں جو ہندوستانی اعلیٰ تعلیمی نظام کی خصوصیات بن گئے ہیں۔''

کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اشارہ کیا ہے کہ گذشتہ حکومتوں کے ذریعے اعلیٰ تعلیم کی سطح پر فنڈ میں کمی بھی اس شعبے میں نجی سرمایہ کاروں کی بہتات کی وجہ رہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک تکنیکی یا پروفیشنل ادارے کو شروع کرنے اور اسے چلانے کے لیے درکار لیاقت اور صلاحیت کو پرکھنے کے لیے نہ تو کوئی منظم پالیسی ہے اور نہ ہی ان پر لگام کسنے کے لیے کوئی ضابطۂ اخلاق موجود ہے۔ اس کمی کا فائدہ ایسے سرمایہ کار اٹھاتے ہیں جن کا مقصد تعلیم کی تجارت کے ذریعے صرف اور صرف پیسہ کمانا ہے۔ حالانکہ کمیٹی نے اعلیٰ تعلیم کے موجودہ پھیلاؤ کو دوگنا کرنے کے مقررہ نشانے تک رسائی کے لیے تعلیم کے شعبے میں نجی شرکت پر زور دیا ہے لیکن ساتھ ہی اس بات کو بھی واضح کردیا ہے کہ حکومت اپنی ذمے داری سے دستکش نہیں ہوسکتی اور یہ کہ تعلیم کو پوری طرح سے نجی ہاتھوں میں نہیں سونپا جاسکتا۔ نجی تعلیمی اداروں میں ہونے والی بدعنوانیوں مثلاً خاندان مرکوز انتظامیہ، کیپٹیشن فیس کا رواج، اساتذہ کو کم تنخواہ اور طلبہ سے زیادہ فیس، گنجائش سے کہیں زیادہ داخلے اور طلبہ کے گریڈ کو Manipulate کرنا وغیرہ پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے، کمیٹی نے ایک ایسا لائحۂ عمل وضع کیے جانے کی ضرورت پر زور دیا ہے جو یقینی طور پر ان برائیوں کا ازالہ کرسکے۔

ڈیمڈ یونیورسٹیوں کے تعلق سے کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ فی الحال اداروں کو ڈیمڈ یونیورسٹی کا درجہ تفویض کرنے کے عمل کو روک دیا جانا چاہیے اور موجودہ ڈیمڈ یونیورسٹیوں کے لیے یہ لازمی ہونا چاہیے کہ تین سال کی مدت میں وہ یہ ثابت کریں کہ ان کی کارکردگی مجوزہ نئے ضابطۂ تشخیص کے عین موافق ہے اور جو ادارے ایسا کرنے سے قاصر رہیں ان کی یونیورسٹی حیثیت ختم کردینی چاہیے۔

رپورٹ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ یونیورسٹی ایک ایسا ادارہ ہونا چاہیے جہاں ایک چھت کے نیچے ''مکمل تعلیم'' کا انتظام ہو۔ جہاں ہر طرح کی تعلیم اور سارے علوم کی تدریس اور تربیت کی سہولت ہو۔ پروفیشنل اور ووکیشنل موضوعات کی تعلیم بھی ہونی چاہیے لیکن اس طرح کہ ملک کے سماجی اور تہذیبی حقائق سے اس کا رشتہ منقطع نہ ہو۔ رپورٹ کے مطابق ''پروفیشنل تعلیم کو عام تعلیم سے علیحدہ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔'' اسی لیے کمیٹی نے یہ سفارش کی ہے کہ پروفیشنل تعلیم میں بہتر کارکردگی دکھانے والے اداروں مثلاً IITs اور IIMs کو ایک مکمل یونیورسٹی میں تبدیل کیا جانا چاہیے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ان اداروں کی اپنی مخصوص شناخت اور انفرادیت قائم رہے۔

کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اس بات کا بھی اظہار کیا ہے کہ علم کو خانوں

میں بانٹنا اور اسے مختلف شعبوں کے تحت مخصوص کر دینا، ہمارے اعلیٰ تعلیمی نظام کو کمزور بنا دینے کی ایک اہم وجہ ہے۔ ان شعبوں کے درمیان باہمی لاتعلقی کے سبب مختلف تنظیمی اداروں کی تشکیل کی ضرورت پیش آئی۔ موجودہ وقت میں ملک بھر میں اس طرح کے 13 ادارے موجود ہیں جن میں UGC، AICTE، میڈیکل کاؤنسل آف انڈیا (MCI) اہم ہیں جو بھی پارلیمنٹ کے متعدد ایکٹ کے تحت وجود میں آئے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم میں ''تحقیق'' کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کمیٹی نے کہا ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں ایسے اداروں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں جہاں صرف درس و تدریس کا عمل ہوتا ہے اور طلبہ کا امتحان لیا جاتا ہے، تحقیق سے ان کا رشتہ ٹوٹتا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس جو نئے تحقیقی ادارے وجود میں آ رہے ہیں، ان میں صرف تحقیقی کام ہوتا ہے۔ کمیٹی کے مطابق سبھی تحقیقی اداروں کے لیے یہ ضروری ہونا چاہیے کہ وہ یونیورسٹیوں سے رشتے استوار رکھیں اور تدریسی عمل میں بھی شامل ہوں نیز تمام یونیورسٹیوں کو تدریسی اور تحقیقی یونیورسٹیوں کے روپ میں فروغ دیا جانا چاہیے۔

اس پورے تناظر میں کمیٹی نے جو سفارشات کی ہیں ان میں اعلیٰ سطحی آئینی کمیشن کے قیام کی تجویز بہت اہم ہے۔ مجوزہ کمیشن کا نام ''قومی کمیشن برائے اعلیٰ تعلیم و تحقیق'' (NCHER) ہوگا جو ملک بھر میں اعلیٰ تعلیمی اداروں کے نظم و نسق کے لیے ذمے دار ہوگا۔ مجوزہ کمیشن یونیورسٹیوں کی تعلیمی آزادی اور ان کی خودمختار حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے تحقیق اور تعلیم کے فروغ کے لیے یونیورسٹیوں کو امداد بہم پہنچائے گا۔

اس کمیشن کی ساخت اور ترتیب اس طرح ہوگی کہ کسی طرح کی سیاسی یا سرکاری مداخلت کی گنجائش نہ ہو۔ یہ ایک خودمختار ادارہ ہوگا جس کی تشکیل آئینی ترمیم کے ذریعے کی جائے گی اور جو صرف پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ کمیشن کے لیے فنڈ مختص کرنے کی ذمے داری وزارت برائے مالیات کی ہوگی۔ یہ کمیشن ایک سات رکنی بورڈ پر مشتمل ہوگا جس کا ایک کل وقتی چیئرپرسن مقرر کیا جائے گا۔ سات ممبروں میں سے ایک مشہور صنعت کار اور ایک اہم سماجی کارکن ہوگا۔ باقی پانچ تعلیم کے مختلف شعبوں کی مشہور ہستیاں ہوں گی۔

چیئرپرسن کی حیثیت چیف الیکشن کمشنر جیسی ہوگی اور باقی ممبران الیکشن کمشنرز کے ہم پلہ ہوں گے۔ چیئرپرسن اور ممبران کی تقرری ایک ''سرچ کمیٹی'' کے ذریعے کی جائے گی جس کے اراکین میں وزیر اعظم، حزب مخالف کا لیڈر اور ہندوستان کے چیف جسٹس ہوں گے۔

رپورٹ کے غائر مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر یش پال کی قیادت میں کمیٹی نے نہایت سنجیدگی اور باریک بینی سے اعلیٰ تعلیم سے متعلق مختلف عوامل کا تجزیہ کیا ہے اور اعلیٰ تعلیم میں اصلاح کے لیے اہم تجاویز پیش کی ہیں۔ کمیٹی کی بعض سفارشات پر تکنیکی نقطۂ نظر سے بحث ہو سکتی ہے لیکن مجموعی طور پر اس رپورٹ کو اعلیٰ تعلیمی نظام میں اصلاح کی سمت ایک اہم پیش رفت مانا جا رہا ہے۔ کمیٹی کی سفارشات کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے وزیر ترقی انسانی وسائل جناب کپل سبل نے وزارت کے آئندہ سو دنوں کے پروگرام میں انھیں شامل کیا ہے۔ ایک خودمختار آئینی کمیشن کے قیام کی تجویز کو وزارت کے پروگرام میں ترجیحی بنیاد پر شامل کیا گیا ہے اور اس کے لیے ضروری آئینی ترمیم کو یقینی بنانے کے عزم کا اظہار وزیر موصوف پہلے ہی کر چکے ہیں۔

دراصل وزیر ترقی انسانی وسائل بذات خود تعلیمی نظام میں اصلاح کو حالات اور وقت کا تقاضہ مانتے ہیں نیز اعلیٰ تعلیم کو بہتر اور کارآمد بنانے کے لیے سرگرم عمل بھی ہیں۔ انھوں نے منصب وزارت سنبھالنے کے بعد ہی اس بات کا اشارہ کر دیا تھا کہ وہ تعلیمی نظام کی تشکیل نو کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وزارت ترقی انسانی وسائل کا لائحۂ عمل اس طرح سے تیار کیا گیا ہے کہ تعلیم کی رسائی ملک کے ہر ایک باشندے تک ہو سکے۔ سماج کے وہ طبقے جو ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہیں انھیں بھی مساوی طور پر اعلیٰ تعلیم کے مواقع حاصل ہو سکیں۔ وزارت نے سو دنوں کا جو نشانہ مقرر کیا ہے اس میں پسماندہ طبقوں، معاشی اعتبار سے کمزور لوگوں اور اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے منصوبوں کو ترجیح دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر معاشی اعتبار سے کمزور طلبہ کو کم شرح سود پر تعلیمی قرض مہیا کرانا، اعلیٰ تعلیم میں SC/ST اور اقلیتی طلبہ کے لیے جاری ریمیڈیل کوچنگ کی اسکیم کو وسعت دینا، اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کی خاصی آبادی والے 100 اضلاع میں ماڈل ڈگری کالجوں کا قیام، ملک کی تمام یونیورسٹیوں میں ''یکساں مواقع کمیشن'' کی تشکیل، اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کی خاصی آبادی والے اضلاع میں قائم شدہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں 100 خواتین ہاسٹلوں کو منظوری وغیرہ ایسے منصوبے ہیں جن کا نفاذ اگر پوری دیانتداری کے ساتھ کیا جائے تو آنے والے وقت میں نہ صرف اقلیتوں اور دیگر پسماندہ طبقات (SC/ST/OBC) کی حالت میں بہتری آ سکتی ہے بلکہ پورے ملک کی تعلیمی تصویر بدل سکتی ہے۔

وزارت ترقی انسانی وسائل کے سو دنوں کے پروگرام میں ہندوستان میں غیر ملکی اداروں کو باضابطہ کرنے کے لیے ایک بل لانا اور تعلیمی اداروں میں ملازمین، افسر، طلبہ اور اساتذہ کے درمیان ہونے والے تنازعات کے ازالے کے لیے ایک تعلیمی ٹریبونل کا قیام جیسے منصوبے بھی شامل ہیں۔ ضرورت ہے ان سارے منصوبوں کو روبہ عمل لانے کی نیز یش پال کمیٹی اور نالج کمیشن نے اعلیٰ تعلیم میں اصلاح کے لیے جو سفارشات کی ہیں ان پر عمل پیرا ہونے کی۔ وزیر ترقی انسانی وسائل جناب کپل سبل نے اس سلسلے میں جن عزائم کا اظہار کیا ہے ان سے امید کی کرن پھوٹتی نظر آ رہی ہے۔

□□□

پتہ:

3520/2, Deep Niwas, Munirka, New Delhi-67

ابوالکلام قاسمی

منیب الرحمٰن اور ہجر و فراق کی نظمیں

گذشتہ چند دہائیوں میں ہیئتی تنقید کی بالادستی نے شاعری کی تنقید کو یک رُخا بنا کر رکھ دیا ہے۔ شعری تخلیقات کی اوپری سطح پر تیرتی ہوئی علامتوں، استعاروں اور تہہ دار اسلوب کے نمایاں وسیلوں کو اتنی اہمیت دے دی گئی ہے کہ ایسے متعدد شاعر تقریباً نظرانداز ہوتے رہے ہیں جن کے یہاں بیان سے زیادہ تحت البیان پر توجہ کرنے، بین السطور میں اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے اور ظاہری طور پر متفرق لفظیات میں استعاروں اور علامتوں کو استعمال کرنے کے بجائے، پوری پوری نظم کو استعارے اور علامت کا نعم البدل بنانے کا رجحان ملتا ہے۔ اخترالایمان، منیر نیازی اور منیب الرحمٰن کی نظمیہ شاعری کو اسی زمرے میں شمار کیا جانا چاہیے۔ اس لیے کہ اخترالایمان اور منیر نیازی پر اچھا خاصا تنقیدی ذخیرہ جمع ہونے کے باوجود صحیح معنوں میں ان کی تعیین قدر ابھی باقی ہے۔ جہاں تک منیب الرحمٰن کا سوال ہے تو ان کی شاعری کے بارے میں دو چار قابل ذکر تحریروں سے زیادہ اور کچھ نہیں ملتا۔ اس سیاق و سباق میں مغنی تبسم کے یہ چند جملے بڑے معنی خیز معلوم ہوتے ہیں:

''منیب الرحمٰن کی شاعری ایک پُراسرار خوب صورت جزیرہ ہے۔ اس جزیرے کی سیر کی توفیق کم لوگوں کو حاصل ہوئی ہے۔ جنھوں نے سیر کی، جو اس کے مناظر سے سیراب ہوئے اور جن پر اس کے بھید منکشف ہوئے، انھوں نے بہت کم کسی کو اس کا اَتا پتا بتایا۔''

اس بات کا ذکر شاید بے محل نہ ہو کہ لفظی گھن گرج، اور سطح شعر پر تیرتی ہوئی شعری تدابیر، ہماری جدید تنقید کو زیادہ راس آتی ہیں۔ جب کہ منیب الرحمٰن ایسے شاعروں میں سے ہیں جن کے دھیمے لہجے، تحت البیانی، علامتی پیکر تراشی اور اپنی منفرد امیجری میں باتیں کہنے کے اسالیب، آسانی سے نئی تنقید کی گرفت میں نہیں آتے۔ چنانچہ اس نوع کی شاعری ہمیشہ اپنے زمانے کے تنقیدی محاورے کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے اس اعتراف کے بغیر بات آگے نہیں بڑھائی جاسکتی کہ منیب الرحمٰن کی شاعری کی سادگی کے اندر چھپی ہوئی پرکاری اور طرفگی کی دریافت، تنقیدی موشگافی کو محض ایک کوشش ناتمام بن کے رہ جانے کے اندیشے سے بہرحال دوچار رکھتی ہے۔

ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق کے بعد سے لے کر آج تک ایسے کم شاعر سامنے آئے جن کو کسی ادبی تحریک یا رجحان کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس صورت حال میں ایسے خود مکتفی شاعروں کے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جن کو اس نوع کی کسی بیساکھی کی ضرورت نہیں۔ ان شاعروں میں منیب الرحمٰن کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں اپنی شاعری کا آغاز کردیا تھا۔ بعض موضوعاتی نظموں کو بنیاد بنا کر ان کو ایک ترقی پسند شاعر ثابت کرنا مشکل نہیں معلوم ہوتا مگر اس بات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی پوری شاعری، ان کا ڈکشن، ان کا لہجہ اور ان کی نظموں کی پہلوداری نے یہ التباس ہمیشہ قائم رکھا گویا وہ حلقۂ ارباب ذوق سے وابستگی رکھنے والے شاعروں میں سے ایک ہوں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''بازدید'' پر سردار جعفری نے ''گفتگو'' میں تبصرہ کیا تو لکھا تھا کہ:

''بازدید کی نظموں میں غم ذات اور غم کائنات، دونوں کی لَو بہت مدّھم ہے۔ ابلاغ اتنا مکمل ہے کہ ہر مصرع نظریں ملا کر بات کرتا ہے۔ آج کل جب توتلے اور ہکلے لفظوں کی بہتات ہے، تو، کوئی تو ہے جو پورے پورے لفظ بول رہا ہے..... لیکن شاعری صرف مرصع سازی نہیں ہے کچھ اور بھی ہے اور اس کچھ کی کمی نے نظموں میں شبنم کی ٹھنڈک تو بھردی ہے، لیکن سورج کی کرنوں کی حرارت سے محروم کردیا ہے..... (منیب الرحمٰن) جدید عہد کے سارے تقاضوں سے واقف ہیں، پھر اتنی آرائش، اتنی ٹھنڈک، اتنی نفاست کیوں؟''

اس پس منظر میں اہم سوال یہ ہے کہ ترقی پسند تنقید نے شاعرانہ صنعت گری اور سرّیت کو اپنی غیر شعری یا نیم سیاسی مقصدیت کی بھینٹ چڑھانے کا جو رویہ اختیار کیا وہ مقام حیرت ہے یا مقام عبرت؟ مگر ان باتوں سے منیب الرحمٰن کی شاعری کی تفہیم کی کلید ضرور ہاتھ آتی ہے۔ ان تاثرات کا مفہوم مخالف ان کے اعتراف کے سوا اور کچھ نہیں۔

منیب الرحمٰن، آج بھی اپنے اسی انداز تکلم، یعنی نرم روی، دھیمے لہجے اور داخلی خودکلامی کے رویوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی بعض نظموں کے حوالے سے ان کی نمائندہ علامتوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مگر ان کی معدودے چند نظموں کے سوا علامتوں کی ظاہری نشان دہی یہ مشکل ہی کی جاسکتی ہے۔ البتہ تہہ دار انداز تکلم ان کی سرشت کا ایک حصہ ہے اور اسی تہہ دار انداز تکلم کے بطن سے ان کی خودکلامی کے سوتے بھی پھوٹتے ہیں اور دھیمے لہجے کے بھی۔ ان کی پوری شاعری میں ان کی نظم ''بازدید'' کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس نظم کا مطالعہ ان کے شعری مزاج کی گتھیاں آسانی سے سلجھا سکتا ہے۔ اس نظم کے بعض مصرعے دہرائے جائیں تو بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ بہت واضح

تصویریں، بہت اونچا آہنگ اور بہت تیز روشنی کے منظرنامے کے برخلاف دھندلکے اور جھٹپٹے کی روشنی اور اس میں شامل ابہام اور اسرار کیوں کر ان کی ترجیحات میں شامل ہیں:

تم جو آؤ، تو دھندلکے میں لپٹ کر آؤ
پھر وہی کیفِ سرِ شام لیے
جب لرزتے ہیں صداؤں کے سمٹتے سایے
اور آنکھیں خلشِ حسرتِ ناکام لیے
ہر گزرتے ہوئے لمحے کو تکا کرتی ہیں
خودفریبی سے ہم آغوش رہا کرتی ہیں
تم جو آؤ تو اندھیرے میں لپٹ کر آؤ
مستیِ بادسبک گام لیے
یوں چلے آؤ کہ دربازنہ ہو
کوئی آواز نہ ہو

عجیب بات یہ ہے کہ ''بازدید'' کی پہلی اشاعت سے لے کر ''ہجروفراق کی نظمیں'' تک کے پورے سفر میں مغنی الرحمٰن کا دھندلکے اور اندھیرے میں لپٹے ہوئے حقائق اور ابہام و اسرار میں ملفوف لب و لہجے والا انداز ایک خاص نوع کی توسیع کے ساتھ ہنوز برقرار ہے۔ ''ہجروفراق کی نظمیں، اس اعتبار سے ان کا ایسا مجموعۂ کلام ہے جس میں موضوع یا پس منظر کی وحدت، نظموں کی کثرت اور تنوع کے باوجود تمام تخلیقات کو ایک دھاگے میں پروئے ہوئے ہے۔ ان نظموں کا اختصاص ان کی تعمیم میں چھپا ہوا ہے۔ اگر تمہیدی تحریر کا سیاق وسباق حذف کر دیا جائے تو ایک کیفیت اور ایک موڈ سے ہم آہنگ ہونے کے باوجود ہر نظم اپنی الگ اور خودمکتفی اکائی رکھتی ہے۔ محبوب کے داخلی محرکات ہر تخلیق میں پوری قوت کے ساتھ روبہ عمل ضرور ہیں مگر ہر تخلیق خارجی حوالوں کی عدم موجودگی یا ذات سے ماورائے ذات تک کی ارتقائی کیفیت کی ترجمان بن جاتی ہے۔ اگر شخصی اور ذاتی اندوہ کو غیر شخصی اور تعمیمی تخلیقی عمل سے نہ گزارا جائے تو شاعری یک زمانی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس مجموعۂ کلام میں مغنی الرحمٰن نے اپنے سابقہ تہہ دار اسلوب کے برخلاف بیانیہ اسلوب کو غالب رکھا ہے، تاہم یہ محض بیانیہ شاعری نہیں شعری بیانیہ کے مترادف ہے۔ ان نظموں میں لہجے کا دھیما پن ان کی مخصوص شناخت کے ساتھ برقرار ہے۔ مگر شاعر کی سابقہ خودکلامی نے یہاں داخلی خودکلامی کا رنگ روپ اختیار کر لیا ہے۔ مصرعوں کے دروبست اور تراکیب کی دل آویزی اپنی جگہ برقرار ہے، مگر ذاتی تجربے کو معروضی انداز میں دیکھنے اور بیان کرنے کا رویہ بہت نمایاں ہو گیا ہے۔

اس مجموعے کی ایک نمائندہ نظم ہے ''چاندنی رات میں خیالات پریشاں''۔ پوری نظم بعض مکالموں پر مرحلہ وار مشتمل ہے، جس نے اس نظم کو کثیرالاصوات بھی بنا دیا ہے۔ کہیں کتوں کے بھونکنے کا ذکر ہے تو کہیں کسی اجنبی کے گزرنے کا وہم، کہیں یوکلپٹس کے درخت پر فوج کے سربستہ سپاہیوں کا شبہ ہے تو کسی طرف کھڑکی پہ دستک کی آواز اور کہیں پتوں کی سرسراہٹ کا دھوکہ۔ نظم کے نقطۂ عروج پر پہنچ کر واحد متکلم کی خود اپنے دل کی دھمک، تمام التباسات کو ایک نقطے پر مرکوز کر دیتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ آخری مصرعوں میں شعری کردار یک لخت شکستِ خواب سے دوچار ہو جاتا ہے اور نظم اپنا فنی دائرہ مکمل کر لیتی ہے۔ آیئے آپ بھی نظم کی قرأت میرے ساتھ کیجیے اور اس کی ساخت کے ساتھ التباس کی کیفیت اور اس کے تحلیل ہونے کا اندازہ لگایئے:

آہ یہ دل کی لگاتار دھمک
روشنی ماند پڑی آنکھوں کی
چاند ٹکڑے ہوا آخر وہ گھڑی
آ پہنچی

رات کے بارہ بجے
دم بدم گونجتے گھنٹے کی صدا
آپ کو وہم ہوا ہے
صاحب، چاندنی رات میں ہر چیز بدل جاتی ہے

آگے ملاحظہ کیجیے کہ کبھی کبھی انسان کے لیے ایک غم کی مرکزیت کیوں اس طرح محورِ حیات بن جاتی ہے کہ زندگی کے سارے منصوبے، تجربے اور چھوٹے بڑے غم و آلام سب کچھ اس کے گرد گردش کرنے لگتے ہیں:

یوں تو یادیں ہیں بہت سے مرے غم خانے میں
کتنے ارماں سے تری یاد کو پالا میں نے

اپنی ذات کے اس داخلی مرکز و محور کی دریافت دراصل انسان کے لیے خود عرفانِ ذات کا بدل ہوتی ہے۔ ایسے ہی موقعے پر انسان ایک عجیب تضاد سے دوچار ہوتا ہے، گویا سورج سوا نیزے پر آ گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی شامِ الم اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔ کچھ اسی نوع کے تجربے سے ہم نظم کو مکمل کرنے والے ان مصرعوں سے دوچار ہوتے ہیں:

دیکھتے دیکھتے ہر تارِ نفس ٹوٹ گیا
ہاتھ سے رشتۂ ہستی کا سرا چھوٹ گیا
خوف تھا جس کا
وہی ساعتِ غم آ پہنچی
ہونٹ لفظوں کو ترستے ہی رہے
اشک آنکھوں سے برستے ہی رہے

ہجر کی رات بھی بادیدۂ نم آ پہنچی
زندگی دشتِ تذبذب میں بھٹکتی کب تک
موت بیٹھی ہوئی یوں راستہ تکتی کب تک
اب مسافر کے لیے راہِ عدم آ پہنچی

منیب الرحمٰن کی پوری شاعری میں عموماً اور ہجر و فراق کی نظموں میں خصوصیت کے ساتھ بصری امیجری سے کہیں زیادہ قوت شامہ اور قوت سامعہ پر مبنی پیکروں کا استعمال ملتا ہے۔ جو لوگ منیب الرحمٰن کے حسی عروج و زوال سے ذاتی طور پر واقف ہیں ان کے لیے نسبتاً ٹھوس حوالہ سامنے آتا ہے کہ حسِ بصارت کا فقدان کیوں کر دوسرے حواس کو تیز اور فعال بنا دیتا ہے۔ ان کی ایک نظم ہے ''صدائے رفتہ'' ہے، جس میں مختلف النوع آوازوں نے نظم کے ڈھانچے کی تشکیل میں بنیادی رول ادا کیا ہے۔ مگر یہ کیفیت صرف اس نظم میں نہیں متعدد نظموں میں ملتی ہے۔ اس کا بنیادی سرا ڈھونڈنے کی کوشش کیجیے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی ابتدائی نظموں میں سے ایک بہت اعلیٰ درجے کی نظم ''اس آواز میں'' بھی ہے، جو ان مصرعوں سے شروع ہوتی ہے:

اس کی آواز میں، آئینے سے بدن، جھلملانے لگے
دھوپ چھاؤں کے ملتے ہوئے
پیرہن سرسرانے لگے اور دل نے کہا......

اس نظم میں آواز کے زیر و بم کی بنیاد پر محبوب کے خد و خال اور سراپا میں شامل تمام تفصیلات تک پہنچنے کی کوشش ملتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبوب گویا آواز میں منقلب ہو کر مجسم، مجرد کثیف سے زیادہ لطیف اور فانی سے زیادہ ابدی بن گیا ہے۔ جب یہ نظم ختم ہوتی ہے تو آواز اپنی پوری معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتی ہے:

وادی و کوہ میں، رنگ و بو کے سراسیمہ انبوہ میں وہ بھٹکتا ہوا راز تھی —
صرف آواز تھی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ صوتی پیکروں کی تخلیق کا منیب الرحمٰن کا قدیم اور متنوع عمل اس نظم میں آ کر پوری طرح مرکوز ہو گیا ہے۔ ''اصوات'' پر مبنی تراکیب کچھ اس طرح ہیں:

پر درد صدا، صبح کی اذاں، کلیسا کا گجر، کس کی آواز ہے یہ
وقت کی گونج
ٹوٹے ہوئے سازوں کی جھنکار، دل میں اٹھنے والی گونج اور بالآخر روح کی آواز

پوری نظم آپ بھی ملاحظہ کیجیے اور اندازہ لگائیے کہ شعری کردار کے اظہار کے سارے وسائل کیوں کر آوازوں کے زیر و بم اور سماعی پیکر کی تشکیل میں ڈھل کر فنی تکمیل کا حصہ بن گئے ہیں:

ایک پُر درد صدا ہجر زدہ
صبح کی جیسے اذاں
یا سر شام کلیسا کا گجر
عمر رفتہ کے دھندلکوں میں نہاں
کس کی آواز ہے یہ
دل کی آواز ہے یہ
دل مرا کس لیے بھر آتا ہے
اجنبی لگتی ہے ہر چیز مجھے
آشنا، کیوں مجھے بیگانہ نظر آتا ہے
وقت اک گونج ہے کھوئی ہوئی آوازوں کی
ایک جھنکار مرے ٹوٹے ہوئے سازوں کی
جب مرا کوئی بھی دم ساز نہ ہو
دور سے ایک صدا آئے گی
دل میں اک گونج اٹھا جائے گی
اے مری روح کہیں وہ تری آواز نہ ہو

□□□

پتہ:
Deptt. of Urdu, Faculty of Arts,
Aligarh Muslim University, Aligarh-202002 (U.P.)

خواجہ میر درد

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

خواجہ میر درد، تصوف کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالات زندگی، ان کی تصانیف اور شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے یہ ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت: -/14 روپے

ابرار رحمانی

تحریکِ آزادی اور پریم چند

(غیر افسانوی تحریروں کی روشنی میں)

پریم چند نے جس دور میں آنکھیں کھولیں، ہر طرف تحریکِ آزادی کا غلغلہ تھا اور محبان وطن اپنی اپنی بساط بھر کچھ کر گزرنے کے جذبے سے سرشار اپنے وطن کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ کچھ لوگ بم اور بارود سے جنگ کر رہے تھے تو کچھ لوگ سیاسی سطح پر عدم تشدد کے ہتھیار سے لڑ رہے تھے۔ وہیں شاعر اور ادیب اپنے کام سے ہی کام لے رہے تھے۔ پریم چند ایک ایسے ہی محب وطن فعال ادیب تھے، جنھوں نے اپنی تحریروں سے تحریک آزادی کو بڑھاوا دیا۔ پریم چند اپنے وطن اور اپنی قوم کی زبوں حالی پر مغموم تھے۔ ''سوز وطن'' ان کی ایسی ہی کہانیوں کا مجموعہ تھا جو حب وطن کے جذبات سے مملو تھیں اور جنھیں پڑھ کر قومی جذبات بیدار ہوتے تھے۔ چنانچہ انگریز حکمرانوں نے اس مجموعے کو ضبط کرلیا۔ پریم چند لکھتے ہیں:

''اس وقت میں سررشتۂ تعلیم میں سب ڈپٹی انسپکٹر تھا اور ہمیر پور کے ضلع مہوبا میں تعینات تھا۔ ''سوز وطن'' کو نکلے چھ مہینے ہو چکے تھے۔ ایک دن رات کو میں کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا پروانہ پہنچا کہ مجھ سے ملو۔ جاڑے کا موسم تھا، میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ ان کے سامنے ''سوز وطن'' کی ایک جلد رکھی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا، اس وقت میں ''نواب رائے'' کے نام سے لکھا کرتا تھا، مجھے اس کا کچھ کچھ پتا چل چکا تھا کہ خفیہ پولیس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے مجھے کھوج نکالا اور صاحب کلکٹر نے اس کی جواب دہی کے لیے مجھے بلایا ہے۔ صاحب نے ایک ایک کہانی کا مجھ سے مطلب پوچھا اور آخر بگڑ کر بولے تمھاری کہانیوں میں Sedition بھرا ہوا ہے...... آخر کار فیصلہ ہوا کہ میں ''سوز وطن'' کی کل کاپیاں جو ایک ہزار چھپی تھیں اور ابھی مشکل سے تین سو جلدیں فروخت ہو سکی تھیں، حکومت کے حوالے کردوں۔ میں نے بقیہ سات سو کاپیاں ''زمانہ'' پریس سے منگا کر صاحب کی نذر کر دیں۔'' (منشی پریم چند کی کہانی ان کی اپنی زبانی، زمانہ، کانپور)

یہ اپنے آپ میں ایک ایسا واقعہ تھا جو اس سے پہلے شاید وقوع پذیر نہیں ہوا تھا۔ واضح ہو کہ پریم چند کی کتاب ''سوز وطن'' کی ضبطی کے بعد ہی انڈین پریس ایکٹ 1910 کے تحت ضبطی کا قانون وضع کیا گیا۔

بہر حال دھنپت رائے نے، جو اس وقت تک نواب رائے کے قلمی نام سے لکھتے رہے تھے، اب اپنے دوست ''زمانہ'' کے ایڈیٹر دیانرائن نگم کے مشورے پر ''پریم چند'' کا نام اختیار کر کے لکھنا شروع کیا اور ایک وقت ایسا آیا جب گاندھی جی کی ایک تقریر سے متاثر ہو کر انھوں نے سرکاری نوکری سے استعفا دے دیا اور آزادانہ لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ مانک ٹالا لکھتے ہیں:

''مہاتما گاندھی ترک موالات کی تحریک کے سلسلے میں 8 جنوری 1921 کو گورکھپور پہنچے تھے۔ غازی میاں کے میدان میں تقریباً دو لاکھ کے مجمع میں ان کی تقریر ہوئی۔ خرابی صحت کے باوجود پریم چند بیوی بچوں سمیت گاندھی جی کی تقریر سننے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ گاندھی جی کی تقریر سے ان کے دل و دماغ پر ایک جادوئی سی کیفیت پیدا ہو گئی اور انھوں نے معلّمی کی سرکاری نوکری سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ بیوی سے مشورے کے بعد 14 جنوری 1921 کو اپنا استعفا ہیڈ ماسٹر کے حضور پیش کر دیا۔ اس زمانے میں پریم چند ایک اسکول میں نائب مدرس تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر چمن لال بہت اچھے انسان تھے اور پریم چند کے بہی خواہ بھی تھے۔ انھوں نے پریم چند کو بہت سمجھایا۔ حالات کی اونچ نیچ کی دہائی دی لیکن پریم چند ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ آخر 15 جنوری 1921 کو پریم چند کا استعفا منظور کرلیا گیا اور پریم چند نے خود کو سرکاری ملازمت سے آزاد کرلیا۔'' (''زمانہ'' پریم چند نمبر، صفحہ 12)

پریم چند اس گھڑی کو نیک ساعت تصور کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مہاتما جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی کے دل میں بھی جان آگئی۔ اس کے دو ہی چار دن کے بعد میں اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفا دے دیا۔'' (پریم چند نمبر ''زمانہ'' کانپور)

1921 میں جب پریم چند نے سرکاری ملازمت سے استعفا دیا، اس وقت انھیں 120 روپے ماہانہ تنخواہ ملتی تھی، جو آج سے تقریباً 40000 روپے کے برابر تھی۔ پریم چند کا بنیادی حوالہ افسانے اور ناول ہیں۔ اور دنیا جانتی ہے کہ ان کی کہانیوں کا آغاز حب وطن اور بیرونی حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کرنے سے ہوا۔ بنارسی داس چترویدی کے نام اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

''میری آکانکشائیں (تمنائیں) کچھ نہیں ہیں۔ اس سے (وقت) تو

سب سے بڑی آکانکھشا (تمنا) یہ ہے کہ ہم سوار جیہ سنگرام (جنگ آزادی) میں وجئی (فتح یاب) ہوں۔ دھن یالپش (پیسے یا شہرت) کی لالسا (خواہش) مجھے نہیں رہی۔ کھانے بھر کومل ہی جاتا ہے۔ موٹر اور بنگلے کی مجھے ہوس نہیں۔ ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار اونچی کوٹی (بلند پایہ) کی پُستکیں (کتب) لکھوں۔ پر ان کا اُدیشیہ (مقصد) بھی سوراج و جے (آزادی حاصل کرنا) ہی ہے۔ مجھے اپنے دونوں لڑکوں کے وشئے (بارے) میں کوئی بڑی لالسا (تمنا) نہیں ہے۔ یہی چاہتا ہوں کہ وہ ایماندار سچے اور پکے ارادے کے ہوں۔ ولاسی (عیاش) دھنی (دولت مند) خوشامدی سنتان (اولاد) سے مجھے گھرنا (نفرت) ہے۔ میں شانتی سے بیٹھنا بھی نہیں چاہتا۔ ساہتیہ اور سودیش کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہتا ہوں۔ ہاں روٹی، دال اور تولہ بھر گھی اور معمولی کپڑے میسر ہوتے رہیں۔''

اس ایک پیراگراف میں پریم چند نے اپنی زندگی اور اپنی خواہشات کا اظہار بخوبی کردیا۔ ایک طرح سے یہ ان کی کل زندگی کا نچوڑ ہے۔

پریم چند نے ملازمت سے سبک دوش ہوکر اپنی زندگی کے باقی ایام تصنیف و تالیف میں گزار دیے۔ ان کے موضوعات میں ملک کی زبوں حالی، فرقہ واریت، لسانی تعصب، تعلیمی پسماندگی، ذات پات اور چھوت چھات، خاص اور اہم ہیں۔ وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر خاص طور پر زور دیتے تھے۔ خلافت کمیٹی کے تئیں ہندوؤں کا منفی رویہ انھیں پسند نہیں تھا۔ خلافت کمیٹی کا قیام 1919 میں ممبئی میں ہوا تھا لیکن ایک طرح سے خلافت کمیٹی کی بنیاد 1914 میں ہی پڑ گئی تھی۔ تاریخ آزادی میں یہ قصہ کچھ اس طرح آتا ہے کہ نومبر 1914 میں ''لندن ٹائمز'' نے ایک مضمون Choice of the Turks شائع کیا، جس میں ترکوں کو پہلی عالمی جنگ میں غیر جانب دارانہ رہنے پر برے انجام کی دھمکی دی گئی تھی۔ مولانا محمد علی نے اس مضمون کا جواب اپنے اخبار ''ہمدرد'' میں اسی عنوان سے لکھا۔ اس کے بعد نہ صرف ان کا اخبار بند ہوگیا بلکہ انھیں نظر بند بھی کردیا گیا۔ انھیں گرفتار کرکے رام پور، دہلی اور چھندواڑہ کے بعد بیتول میں رکھا گیا۔ ان کی گرفتاری سے ملک میں ایک ہیجان سا پیدا ہوگیا اور انگریزوں کی مخالفت اور بڑے پیمانے پر ہونے لگی۔ ان کی رہائی کے لیے ملک کے مختلف حصوں سے ڈیڑھ لاکھ تار وائس رائے اور وزیر ہند کو موصول ہوئے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ پہلی عالمی جنگ (1914-1918) میں برطانیہ کے خلاف جرمنی کی طرف سے ترکی کے جنگ میں کود پڑنے کی پاداش میں ترکی کو پارہ پارہ کردیا گیا۔ ترکی اس وقت مسلمانوں کی عزت و ناموس کی علامت تھا کیوں کہ ترکی میں اس وقت تک کسی نہ کسی صورت میں خلافت قائم تھی۔ 1919 میں خلافت کمیٹی کے قیام کا مقصد حکومت برطانیہ پر اس بات کے لیے دباؤ ڈالنا تھا کہ مسلمانوں کے مقامات مقدس پر یوروپی قبضہ نہ ہونے دیا جائے۔

خلافت تحریک سے بالواسطہ طور پر ہندوستان کی جدوجہد آزادی کو تقویت ملی۔ چنانچہ گاندھی جی نے بھی اس مسئلے میں بہت دلچسپی لی اور اس کی بھرپور حمایت کی۔ اگرچہ بہت سے ہندو حضرات اسے ایک مسلم مسئلہ تصور کرتے تھے اور عام طور پر اس سے خود کو الگ رکھتے تھے۔ پریم چند نے خلافت تحریک کے متعلق ہندوؤں کے اس عام رجحان کو دیکھتے ہوئے کہا تھا:

''حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں نے کبھی خلافت کی اہمیت کو نہیں سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی بلکہ اس کو شبہ کی نظر سے دیکھتے رہے۔ ہم کہتے ہیں اگر ہندوؤں میں ایک بھی کچلو، محمد علی یا شوکت علی ہوتا تو ہندو سنگھٹن اور شدھی کی اتنی گرم بازاری نہ ہوتی۔'' (قحط الرجال۔ زمانہ، فروری 1924)

اس موضوع پر انھوں نے دو مضامین قلم بند کیے۔ ایک ''ترکوں کی معاشرت'' اور دوسرا ''ترکی میں آئینی سلطنت''۔ ایک موقع پر انھوں نے جب دیکھا کہ سیاسی لیڈر آپس میں ہی الجھ رہے ہیں اور اپنے اپنے مفاد کو مقدم جانتے ہیں تو بنارسی داس چترویدی کو 21 مارچ 1936 کو لکھا:

''یہ سیاسی لوگ بڑے مایوس کن ہیں۔ مصنفوں ہی کو ان کی رہنمائی کرنا ہوگی، صوبہ پرستی ہمارے لیے ایک نیا خطرہ ہے۔ جس سے ہمیں ہوشیار رہنا ہے۔''

پریم چند تحریک آزادی کی کامیابی کے لیے قومی یکجہتی کو سب سے زیادہ ضروری اور اہم سمجھتے تھے۔ وہ انگریزوں کے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کے اصول سے بخوبی واقف تھے۔ اسی لیے ملک کی آزادی کے لیے دیش واسیوں کے اتحاد و اتفاق کو لازمی قرار دیتے تھے۔ انھوں نے اسی مقصد کے تحت ماہنامہ ''آزاد'' لاہور میں ''اتفاق طاقت'' ہے (مارچ 1908) کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر سورت کانگریس کے نرم اور گرم یا ماڈریٹ اور نیشنلسٹ خانوں میں تقسیم ہوجانے پر روشنی ڈالتے ہوئے دیش واسیوں کو آپسی پھوٹ سے باز رہنے کی تلقین کی۔ وہیں ان کی نظر میں فرقہ واریت سب سے زہریلا عنصر تھا۔ فرقہ واریت کے خلاف جدوجہد کو مقدس مقصد قرار دیتے ہوئے بنارسی داس چترویدی کو 17 جولائی 1933 کو لکھتے ہیں:

''اسلام کا وِش ورکش'' میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔ لیکن چترپٹ میں اس کا اشتہار چھپا ہے۔ اس سے میں بخوبی بھانپ سکتا ہوں کہ وہ کیا ہے۔ فرقہ پرستی پھیلانے کی یہ انتہائی شرانگیز اور سستی کوشش ہے جس کا پول کھولنا ضروری ہے۔ ہم اقلیت میں ضرور ہیں لیکن ہمیں اس کی پروانہ کرنی چاہیے۔ ہمارا مقصد مقدس ہے۔''

پریم چند ملک اور وطن کی محبت کے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ اس کی ہر چیز سے محبت کی جائے۔ اس زمانے میں دولت مند لوگ غیر ملکی چیزوں، خاص طور پر فرنگی مصنوعات کے استعمال کو باعث فخر سمجھتے تھے۔ پریم چند نے اپنے ہم وطنوں کے اس رجحان کو دیش پریم کے لیے ایک بڑا خطرہ سمجھا اور سودیشی چیزوں کی طرف رغبت دلانے کے لیے کئی مضامین تحریر کیے جن میں ''دیشی اشیا کو کیوں کر فروغ ہوسکتا ہے'' اور ''سودیشی تحریک'' اہم ہیں۔ ''سودیشی تحریک'' میں انھوں نے لکھا:

''تعلیم یافتہ اصحاب، جن میں اکثر دیہاتی ہوتے ہیں، جب اپنے مکان کو جائیں تو اپنے پڑوسیوں کو بھلا برا سمجھا کر سیدھے راستے پر لے آئیں اور جیسی ضرورت دیکھیں، روئی کی کھیتی کو بڑھانے کے لیے کہیں۔ روئی کے بعد چینی یا شکر دوسری جنس ہے جو ہم پانچ کروڑ روپے سالانہ کی باہر سے منگاتے ہیں۔ یہ افسوس کی بات ہے۔ ہمارے ملک کے کارخانے ٹوٹتے جاتے ہیں مگر اس کا سبب صرف تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔ دیہاتی بے چارے تو ولایتی شکر کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے اور اکثر لوگوں نے تو بازار کی مٹھائی کھانا چھوڑ دیا اور شکر ایسی چیز ہے، جس کی پیداوار کو آسانی سے بڑھایا جاسکتا ہے۔ ذرا بھی مانگ زیادہ ہوجائے تو دیکھیے اوکھ کی کھیتی زیادہ ہونے لگتی ہے۔ کسان منھ کھولے بیٹھے ہیں۔ یہی تو ایک چیز ہے، جس سے وہ اپنی زمین کا لگان ادا کرتے ہیں۔ کپڑوں کے روکنے میں چاہے کتنی ہی دقتیں ہوں، مگر شکر کا بند ہونا تو ذرا بھی مشکل نہیں۔ ہم ان لوگوں پر ہنسا کرتے تھے، جو ہم لوگوں کو ولایتی شکر کھاتے دیکھ کر منھ بناتے تھے۔ ہماری نظروں میں وہ لوگ غیر مہذب معلوم ہوتے تھے۔ اب ہم کو تجربہ ہوتا ہے کہ وہ ٹھیک راستے پر تھے اور ہم غلطی پر۔ بدیشی چیزوں کا رواج مہذب لوگوں کا ڈالا ہوا ہے اور اگر سودیشی تحریک کو کامیابی ہوگی تو انھی کے لیے ہوگی۔''

(آوازۂ خلق، 16 نومبر 1905، بحوالہ کلیات پریم چند، جلد 24)

پریم چند نے تحریک آزادی سے متعلق براہ راست یا بالواسطہ جو مضامین لکھے، ان میں سے چند اہم مضامین یہ ہیں:

1. اولیور کرام ویل پر سوانحی مضمون پریم چند نے اس لیے تحریر کیا کہ وہ برطانیہ کی اس پانچویں پارلیمان کا ممبر تھا، جس نے برطانیہ میں شاہی حکومت کا خاتمہ کرکے جمہوری نظام کی بنیاد رکھی۔
2. گوپال کرشن گوکھلے پر ایک مختصر مضمون لکھا کیوں کہ گوکھلے سودیشی تحریک کے حامی اور تقسیم بنگال کے سخت مخالف تھے۔
3. رانا پرتاپ پر اس لیے سوانحی مضمون تحریر کیا کہ وہ آزادی کے لیے سب کچھ قربان کردینے کی علامت تھے۔ اس مضمون میں پریم چند نے لکھا:

''...... اس کے نام پر مندر اور شوالے گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ میں رکھے جائیں اور ان میں آزادی کی دیوی کی پرستش کی جائے۔ لوگ جب ان مندروں میں جائیں تو آزادی کا نام لیتے ہوئے جائیں اور وہاں اس راجپوت کی سوانحی زندگی سے سچی آزادی کا سبق سیکھیں......''۔

4. ان کا ایک مضمون ''عہد اکبر میں ہندوستانی حالات'' ہے، جس میں برٹش دور حکومت کا موازنہ عہد اکبر سے کرتے ہوئے پریم چند نے لکھا ہے:

''بعض اصحاب کا خیال ہے کہ اکبر کے زمانے میں رعایا کو چاہے کیسا ہی سکھ چین کیوں نہ ہو، مگر انگریزی راج کا اس سے کیا مقابلہ۔ شاید ایسا ہی ہو مگر فرق صرف اتنا ہے کہ اکبری رعایا کے دلوں میں بادشاہ کی جانب سے خوش اعتقادی پیدا ہوگئی تھی، وہ اس کو اپنا بادشاہ سمجھتے تھے۔ برعکس اس کے انگریزی بادشاہت چاہے کتنا ہی آرام و آسائش کیوں نہ پہنچائے، ابھی تک ایک اجنبی بادشاہت خیال کی جاتی ہے کیوں کہ وہ رعایا سے یگانگی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔'' (ماہنامہ اردوئے معلی، نومبر 1907)

5. ''ہماری اخلاقی پستی کا قومیت پر اثر'' اس مضمون میں پریم چند نے ایک بار پھر تفرقے اور نااتفاقی کو ساری خرابیوں کی جڑ قرار دیتے ہوئے متحد ہوکر برطانوی سامراج سے نبرد آزما ہونے کی تلقین کی ہے۔
6. صوبہ ''متحدہ میں ابتدائی تعلیم'' تعلیم کو سماجی اور سیاسی بیداری کے لیے پریم چند انتہائی ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ تعلیم کی طرف رغبت دلانے کے لیے انھوں نے اس قسم کے مضامین بھی تحریر کیے تاکہ اہل وطن میں شعور بیدار ہو اور وہ آزادی کی جنگ کے لیے خود کو وقف کرسکیں۔

''ہندو تہذیب اور رفاہ عام''، ''زراعتی ترقی کیوں کر ہوسکتی ہے'' اور ''دور جدید و قدیم'' بھی ایسے مضامین ہیں، جو دیش واسیوں میں سماجی اور سیاسی بیداری پیدا کرنے والے تھے۔

پریم چند نے اپنی کہانیوں اور ناولوں سے اردو ادب میں بیش بہا اضافے کیے۔ ایسے اضافے جن کے ذکر کے بغیر اردو فکشن کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ وہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ پریم چند کی غیر افسانوی تحریریں بھی ہندوستان کی تحریک آزادی کے درخشاں باب کا عنوان جلی ہیں۔

□□□

پتہ:
Tazeen Apartment,
179/22, Zakir Nagar,
New Delhi-25

سرورالہدیٰ

نثار احمد فاروقی ـــ بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد

نثار احمد فاروقی کے انتقال سے اردو دنیا میں جو خلا پیدا ہوا تھا اس کا احساس گزرتے وقت کے ساتھ شدید ہوتا جارہا ہے۔ اس خلا کو وہ لوگ زیادہ محسوس کرسکتے ہیں جن کی دلچسپی عصری تنقید کے نظریاتی مباحث کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے دیگر شعبوں سے بھی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کون باشعور شخص ہوگا جو عصری تنقید کے نام پر دیگر علوم وفنون کی طرف سے آنکھیں بند کرلے گا؟ میں نے جس سیاق میں علم وفن کے مختلف شعبوں کا ذکر کیا ہے اسے نثار احمد فاروقی کی شخصیت سے بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ علم و ادب کا ہر شعبہ ریاضت چاہتا ہے۔ نثار احمد فاروقی کہا کرتے تھے کہ اب لوگ محنت نہیں کرتے۔ یہ سادہ سا جملہ ان کی علمی و ادبی ریاضت کے ساتھ ساتھ ایک کرب کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ انھوں نے اپنی تعلیمی زندگی کے آغاز سے آخری دم تک جب محنت اور مشقت کا ثبوت پیش کیا اس کی جگہ اب عجلت پسندی نے لے لی ہے، آج نثار احمد فاروقی کو یاد کرنا تحقیق وتنقید کی سنجیدہ روایت سے روبرو ہونا ہے۔ موجودہ معاشرہ ریڈی میڈ تحقیق اور پھر اس کی ریڈی میڈ تحسین چاہتا ہے۔ اکا دکا مثالوں سے قطع نظر عمومی صورت حال حوصلہ افزا نہیں کہی جاسکتی، ایسے میں نثار احمد فاروقی کے وہ دن کون یاد کرے گا جب وہ دہلی یونیورسٹی کی لائبریری میں ملازم تھے اور نہایت مشکل وقت میں انھوں نے ان اہم کتابوں کو پڑھ لیا تھا جن کی طرف نگاہیں کم کم جاتی ہیں اور جو گرد آلود بھی تھیں۔ لائبریری کی ملازمت کا زمانہ ان کے علمی و ادبی سفر کا ایک اہم واقعہ ہے۔ وہاں سے نکل کر وہ اسی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں لکچرر، ریڈر، پروفیسر اور صدر شعبہ ہوئے۔ وہ مزاجاً آرام طلب نہیں تھے آسائشوں اور سہولتوں نے ان کی لگن میں اور اضافہ کیا۔ دہلی یونیورسٹی کی پرانی کتابوں کے حاشیے پر نثار احمد فاروقی کی رائیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک اہم اور دلچسپ مضمون ''دردِ سرِ خودی سرایم'' میں اس جانب اشارہ کیا ہے۔ نثار احمد فاروقی کی ذاتی لائبریری کی جو کتابیں میری نظر سے گزری ہیں ان سب پر میں نے کچھ نہ کچھ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ہے۔ خصوصاً ان کی تصانیف کے ذاتی نسخے تو ترمیم و اضافے سے پُر ہیں۔ ''تلاشِ غالب'' اور ''تلاشِ میر'' کے ان کے ذاتی نسخے میرے پیش نظر ہیں جن میں جا بہ جا حذف و اضافے اور مستقبل کے منصوبے کی جانب اشارے درج ہیں۔ اپنی مطبوعہ تحریروں کے تعلق سے وہ بہت حساس تھے۔ علمی و ادبی معاملات میں انھیں قائل کرنا آسان نہیں تھا۔ اگر بات انھیں قرین قیاس معلوم ہوتی تو وہ خندہ پیشانی سے قبول بھی کرلیتے تھے یوں بھی قیاسی اور امکانی باتوں کے تعلق سے ان کا ذہن اپنے معاصرین میں زیادہ فعال اور مرتب تھا۔ وہ حقائق کی پیش کش میں بے باک تھے۔ جب اپنی کیفیت میں ہوتے تھے تو پھر کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ گفتگو کرتے وقت ایک رنگ آتا اور دوسرا جاتا تھا، ہم نے لوگوں کو یہ بھی کہتے سنا کہ نثار صاحب چل پڑے تو پھر کسی کی خیر نہیں، جب تک وہ چپ بیٹھے ہیں بیٹھے ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ انھیں یہ خوب معلوم ہوتا تھا کہ کہاں بولنا ہے اور کتنا بولنا ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے وہ کسی بات کے کہنے میں پس وپیش سے کام نہیں لیتے تھے، خصوصاً ادبی محفلوں میں بروقت اور برجستہ بولتے تھے، میں نے یہ بھی دیکھا کہ اگر کوئی ان کے مقالے پر کچھ اعتراض کرتا تو اسے سنتے تو تھے لیکن ہر اعتراض کا جواب نہیں دیتے تھے۔ جب ناظم یہ کہتا نثار صاحب کچھ کہنا ہے تو کہیے ''اجی کچھ نہیں، اجی کچھ نہیں'' میں ان کا علمی غرور پوری طرح سمٹ آتا تھا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے بین الاقوامی میر سیمینار میں میں نے پہلی بار انھیں قریب سے دیکھا اور سنا تھا۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا ''میر دہلی میں'' دوسرے صاحب کا موضوع تھا ''میر لکھنؤ میں'' مضمون نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ میر کو میر لکھنؤ نے بنایا۔ وہاں ان کی شادی ہوئی اور وہ سہولتیں حاصل ہوئیں جو دہلی میں انھیں نہیں مل سکیں، نثار احمد فاروقی نے بعد میں پرچے پر اظہار خیال کرتے ہوئے پورے مجمع کو قہقہہ زار بنادیا۔ انھوں نے کہا کہ لوگ داماد کی خاطر مدارات تو کرتے ہی ہیں اس میں نئی بات کیا ہے آپ نے اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت پیش کیا۔ لیکن آپ کو شاید معلوم نہیں، میر کی اولاد لکھنؤ میں رکشہ چلاتی تھی، یہ کیسی آسودگی اور فارغ البالی تھی۔ مجمع سنجیدہ اور خاموش تھا۔ اسی خاموشی سے ایک آواز آئی فاروقی صاحب یہ کہاں لکھا ہے تو ان کا جواب تھا ''میں کہہ رہا ہوں۔'' اصل میں ''میں کہہ رہا ہوں'' نثار احمد فاروقی کا بنیادی مزاج نہیں تھا وہ بعض موقعوں کی نزاکت کے پیش نظر ایسا لہجہ اختیار کرلیتے تھے۔ انھوں نے دلیلیں بھی پیش کیں مگر ان کا ''نہیں'' سب کے لیے قابل قبول تھا۔ ادبی محفلوں میں عام طور پر ان کی شرکت خوف کا سبب ہوا کرتی تھی۔ میں نے کئی محفلوں میں مقالہ نگار کو ان کے سامنے لرزہ براندام دیکھا ہے۔ ایک پروفیسر کو یہ کہہ کر ڈانٹا تھا کہ آپ کو معلوم ہے پروفیسر کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ جو جی میں آتا ہے بولتے اور لکھتے رہتے ہیں۔ عموماً وہ شیروانی پہن کر محفلوں میں آتے تھے اور سر پر مخمل کی ٹوپی

ہوتی تھی۔ راہ چلتے ہوئے ان کی نگاہ بہت نیچی ہوا کرتی تھی۔ مخاطب سے بہت کم آنکھیں ملا کر بات کرتے تھے۔ کرسی پر ذرا ترچھے ہوکر بیٹھتے۔ مخاطب کو کبھی یہ دھوکہ ہوسکتا تھا کہ فاروقی صاحب اس کی بات ٹھیک سے نہیں سن رہے ہیں لیکن آنکھیں نہ ملانا اور ذرا ترچھے ہوکر بیٹھنا ان کا شعوری عمل نہیں تھا فطری طور معمول تھا لیکن جب کام کی باتیں ختم ہوجاتی تھیں تو وہ پہلو بدلنا شروع کردیتے۔ وہ اپنے لوگوں سے بہت خائف رہتے تھے جو اپنے موقف کے اظہار میں پیچیدہ اور گنجلک ہوں۔ ان کے مزاج میں سختی ضرور تھی لیکن وہ مہربان بھی بہت تھے۔ میں نے دروازے پر سے انھیں بعض لوگوں کو لوٹاتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک موقع پر کوئی رقعہ بردار آیا اور کہنے لگا کہ صاحب نے اس کا جواب مانگا ہے۔ اسی وقت رقعے کے چار ٹکڑے کیے اور کہا کہ یہ جواب ہے۔

اپنے معمولات کے سلسلے میں وہ بہت سخت تھے۔ ان کے نزدیک اخلاقیات کا مطلب اپنے معمولات میں خلل ڈالنا نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی کو بلانے میں یا کسی کے بلاوے پر جانے میں وقت کی پابندی کا لحاظ کرتے تھے، سامنے والے سے وہ فوراً کہتے کہ آپ اتنی دیر سے آئے ہیں اب میں اتنی دیر بعد آپ سے رخصت ہونا چاہوں گا۔ علمی تعاون کا یہ عالم تھا کہ ذاتی لائبریری سے بہت اہم کتابیں وہ ریسرچ اسکالر یا ضرورت مند شخص کو اس شرط کے ساتھ عنایت کرتے کہ وقت پر انھیں واپس کردیں۔ وہ گفتگو کو طول نہیں دیتے تھے، بہت چھوٹے، واضح اور قطعی جملے استعمال کرتے تھے۔ انھیں ملاقاتوں میں کسی کو مرعوب کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اپنے علمی خزانے سے اتنا ہی مال نکالتے تھے جتنے کا سامنے والا ضرورت مند اور مستحق ہوتا۔ فون کی گھنٹی بجتی تو اپنے ریڈنگ روم سے ہائے ہائے کہتے ہوئے دوسرے کمرے میں جاتے ریسیور اٹھاتے تو کہتے ''ہیلو'' ''جی'' ان دونوں الفاظ کو وہ اس طرح کھینچ کر ادا کرتے کہ اس سے بے انتہا نیازمندی ٹپکتی۔ وہ لکھتے لکھتے قلم سے سر کھجانے لگتے۔ ایسا اس وقت ہوتا جب کسی سنجیدہ مسئلے پر کچھ لکھ رہے ہوں یا کوئی نکتہ سامنے آ گیا ہو۔ ایک نہ ختم ہونے والی بے چینی اور بے قراری ان کی شخصیت کا حصہ تھی۔

اس کا تعلق ان کے گہرے علم کے ساتھ ساتھ تصوف کی روایات سے بھی تھا۔ تصوف کی علمی و عملی روایات ان کے خاندانی بزرگوں کے توسط سے ان تک آئی تھیں۔ وہ عربی فارسی اردو کے علاوہ بہت اچھی انگریزی لکھنا اور بولنا جانتے تھے۔ زمانے سے آنکھیں ملا کر بات کرنے کے لیے وہ انگریزی تعلیم پر بہت زور دیتے تھے۔ وہ پرانی قدروں کے آدمی تھے مگر ساتھ ہی بہت روشن خیال۔

شخصیت میں علمی و روحانی جلال و جمال کی یکجائی نے انھیں منفرد بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ انھیں ایک سچی نسبت بھی حاصل تھی۔ یہ نسبت کبھی کبھی ان کی شخصیت پر غالب آجاتی تھی۔ میں نے ایسے لمحے بھی دیکھے ہیں جب وہ بالکل خاموش ہوجاتے۔ اپنے مضمون ''درمدح خودی سرایم'' میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے بھی ان کے شخصی معاملات میں انھیں اوّلیت کا پاس ولحاظ بہت رہتا تھا۔ وہ دوسروں کی اوّلیت کے اعتراف میں اپنی اوّلیت کو نہیں بھولتے تھے۔ کئی مقامات پر انھوں نے لکھا کہ پہلی بار میں نے بتایا یا پہلی بار میں نے تحقیق کی وغیرہ وغیرہ۔ وہ ایسی خاکساری کے اظہار سے بھی گریزاں تھے جس سے دکھاوے کی بو آتی ہو۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''دہلی میں ادارۂ شمع نے پہلے دیوان سنگھ مفتوں سے ہفتہ وار ''ریاست'' خریدا۔ اس کے دو تین شمارے نکلے تھے کہ مفتوں صاحب سے کسی بات پر اختلاف ہوگیا تو حافظ محمد یوسف دہلوی نے ہفتہ وار کا نام بدلنا چاہا۔ نئے ہفتہ وار کا نام ''آئینہ'' میں نے ہی تجویز کیا تھا۔ اس کے مدیر یوسف دہلوی صاحب تھے اور شعبۂ ادارت میں میرے علاوہ اشرف بھوپالی مرحوم تھے بعد میں ''شاہراہ'' سے الگ ہوکر ظ۔ انصاری مرحوم آگئے تھے۔ لیکن شعبۂ ادارت سے میرا تعلق برابر باقی رہا اور یوسف دہلوی صاحب نے میرے ساتھ ہمیشہ بہت اچھا سلوک کیا۔ ظ۔ انصاری صاحب اب مرحوم ہیں ان کے بارے میں کچھ کہنا مناسب نہیں۔ مگر اسی زمانے میں انھیں بہت قریب سے دیکھا اور پرکھا۔ اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے سے منافقانہ تعلقات رکھتے تھے۔''

منافقانہ تعلقات کا اعتراف کرنا ہی ایک طرح کی صاف گوئی ہے اور اس پر پردہ ڈالنا گویا نئی منافقت کو راہ دینا ہے۔ نثار احمد فاروقی اپنے محسوسات کے اظہار میں تکلف سے کام نہیں لیتے تھے۔ دوسرے شخص کو پتہ ہوتا تھا کہ فاروقی صاحب کی رائے اس کے بارے میں کیا ہے۔ وہ اگر چاہتے تو ظ۔ انصاری کے تعلق سے منافقانہ تعلقات کا ذکر ہی نہ کرتے مگر شاید ان کی یہ داخلی مجبوری تھی۔ ایسی داخلی مجبوریاں نثار احمد فاروقی کے یہاں بہت آسانی سے تلاش کی جاسکتی ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ پہلو بہت توجہ طلب ہے اس کے بغیر نثار احمد فاروقی کی شخصیت کو سمجھا نہیں جاسکتا۔ مخالفین کب اور کس طرح بن جاتے ہیں اس بارے میں وہ بڑی دلچسپ گفتگو کیا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کی فتوحات اور ترقیات میں اس کے مخالفین کا بھی ایک حصہ ہوتا ہے لہٰذا ایک سطح پر وہ بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہوتے ہیں۔ وہ اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کرتے تھے کہ کوئی شخص دوسروں کی مخالفت میں اپنا وقت برباد کرے، ان کے نزدیک یہ ایک طرح کی کم عقلی تھی۔ آپ تو خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہیں اور دوسرا شخص آپ کی مخالفت میں اپنا وقت ضائع کرے۔ ''تلاش میر'' کے حرف ابتدا میں انھوں نے لکھا ہے۔

''جن دوستوں کو ان مضامین کے مطالعے سے کچھ روشنی یا انبساط ملے، ان سے دعائے خیر کا خواستگار ہوں اور جو مجھ سے سخرگی و مطربی کے طلب گار

تھے، ان کی امیدوں کے عقیم رہ جانے کا مجھے ملال ہے۔" (تلاش میر، ص-16)

کہا جاتا ہے کہ انھوں نے منصوبہ بند طریقے سے یک موضوعی کام نہیں کیا، ہمارے کچھ اہم ترین محققین اور ناقدین کا علمی و ادبی سرمایہ متفرق مضامین پر مشتمل ہے۔ متفرق مضامین کی تحقیقی اور تنقیدی سطح یک موضوعی کتابوں سے بھی بلند ہوسکتی ہے۔ لہٰذا متفرق مضامین اور یک موضوعی کتاب کے مسئلے میں الجھنے سے اچھا یہ ہے کہ جو کچھ موجود ہے اس سے بامعنی رشتہ قائم کیا جائے۔ ان کی دو مشہور کتابیں "تلاش میر" اور "تلاش غالب" میں شامل مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں بعد میں کتاب کی شکل دی گئی۔ ان کتابوں کا قاری میر اور غالب کے تعلق سے نثار احمد فاروقی کی گہری نظر اور فکری تسلسل کا اندازہ کرسکتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب کے ذہن میں ان شعرا کے تعلق سے کچھ مسائل تھے جنھیں وہ حل کرنا چاہتے تھے۔ "تلاش میر" کے دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے:

"اگر مجھے زندگی میں وہ فرصت اور فراغت نصیب رہی ہوتی جو علمی کدوکاوش اور تحقیق و تلاش کے لیے شرط اوّل قدم ہے تو شاید ان مضامین کا معیار کچھ اور ہوتا۔ اب تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ "برگِ سبز است تحفۂ درویش۔"

"ان مضامین کا معیار کچھ اور ہوتا" یہ جملہ اس شخص کے قلم سے نکلا تھا جس نے کبھی سہل پسندی سے کام نہیں لیا کسی ماخذ اور حوالے کی تلاش میں جس کی دیوانگی مثالی تھی۔ پرانی اور نایاب کتابوں اور نسخوں کو دیکھ کر ان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا۔ کوئی پہلو کوئی مسئلہ اگر ان کی گرفت میں آگیا تو وہ خود کو آسانی سے ان سے الگ نہیں کرپاتے تھے۔ متن کے سلسلے میں یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ اس میں چمک نقاد کی نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ لفظ بولنے اور گنگنانے لگتے ہیں۔ لیکن نثار احمد فاروقی جیسے محقق کے سامنے متن کے بولنے اور گنگنانے کی نوعیت تھوڑی مختلف تھی، متن کی صحیح قرأت اور اس کی اصل صورت کی دریافت کے عمل میں بھی متن فعال اور متحرک ہوجاتا ہے۔ میر اور غالب کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے کہ کسی نئے موضوع کی تلاش آسان نہیں۔ مگر فاروقی صاحب کا ذہن کسی نہ کسی نئے پہلو کو تلاش کرلیتا تھا۔ اس تلاش کے عمل میں ان کی نگاہ سوانحی خاکے اور گم شدہ متن کی طرف زیادہ مرکوز ہوتی تھی۔ اردو تذکروں میں کم معروف شعرا کے سلسلے میں بھی وہ بہت حساس تھے۔ ان شعرا کے شعری متن اور حالات زندگی کی تلاش سے انھیں بڑی گہری دلچسپی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ کسی زمانے کی مجموعی شعری فضا کو سمجھنے کے لیے کم معروف شعرا کی خدمات کو بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نثار احمد فاروقی نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے ان کے بارے میں مواد کم ملتا ہے یا سرے سے ملتا ہی نہیں۔ نثار احمد فاروقی نے خصوصیت کے ساتھ تحقیق شدہ بات کو دہرانے سے گریز کیا ہے۔ تحقیق شدہ بات ان کے یہاں بطور حوالہ آتی ہے جہاں انھیں اس کی بنیاد پر کوئی نئی بات کہنی ہو یا اسے رد کرنا مقصود ہو۔ سوال یہ ہے کہ نئے حوالے اور ماخذ کہاں سے آئیں گے۔ تمام تر تلاش کے بعد اگر کسی شعری یا نثری متن کے بارے میں کسی کی کوئی رائے نہ ملتی ہو تو ایسی صورت میں کسی کو بھی اپنی اوّلین رائے قائم کرنی ہی ہوگی چنانچہ نثار احمد فاروقی نے بھی بعض متون کے بارے میں اپنی اوّلین رائے اور بے باکانہ رائے پیش کردی ہے۔ ان کا ایک مضمون "غالب اور ریاض الافکار" ہے۔ "ریاض الافکار" وزیر علی عبرتی عظیم آبادی کا تذکرہ ہے جس میں 106 نثر نگاروں کے نثری نمونے درج ہیں۔ جن میں غالب کی نثر بھی شامل کی گئی ہے۔ فاروقی صاحب نے مختار الدین احمد آرزو کا شکریہ ادا کیا ہے کہ انھوں نے اپنی ذاتی لائبریری سے "ریاض الافکار" کا قلمی نسخہ انھیں عنایت کیا، نثار احمد فاروقی، غالب اور ریاض الافکار" کے ضمن میں لکھتے ہیں:

اس تذکرے میں مرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی کا ترجمہ بھی شامل ہے اور ظاہر ہے کہ یہ ان کی زندگی ہی میں لکھا گیا ہے۔ غالب کی نثر کے نمونے کے طور پر ان کے ایک فارسی خط کا اقتباس پیش کیا گیا ہے۔ یہ خط کلیاتِ نثر غالب میں موجود ہے، مگر ہم اس کی متعلقہ عبارت یہاں اس لیے نقل کررہے ہیں کہ اس میں نسخۂ مطبوعہ سے بعض اختلافات بہت اہم پائے جاتے ہیں۔ ہم نے مقابلہ کلیات نثر غالب کے اس مطبوعہ نسخے سے کیا ہے جو مطبع منشی نولکشور سے جنوری 1868 میں چھپا تھا۔" (تلاش غالب، ص-67)

"ریاض الافکار" کا سال تالیف 1852 ہے۔ لہٰذا زمانی قربت کے تعلق سے غالب کی فارسی عبارت کی اہمیت تحقیقی نقطۂ نظر سے دوچند ہوجاتی ہے۔ متون میں پائے جانے والے اختلافات کی نشاندہی سے بعض لوگ گھبراتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو سہل پسندی ہے اور دوسری بڑی وجہ اختلافات اور متن کی مختلف قرأتوں کی اہمیت سے نابلد ہونا ہے۔ سوال یہ ہے "ریاض الافکار" میں اور "کلیات نثر غالب" کی عبارتوں میں فرق کیوں ہے؟ اور اس فرق اور اختلاف کو نشان زد کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ یہ سوال اگر نثار احمد فاروقی سے کیا جاتا تو ان کی کیفیت کیا ہوتی اس کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کا ایک اور اہم مضمون "نکات الشعرا کی ایک اور روایت" ہے۔ اس مضمون کے تعلق سے ہمارے عہد کے ایک اہم محقق حنیف نقوی نے اظہار خیال کیا ہے جو ان کی کتاب "میر و مصحفی" میں دیکھا جاسکتا ہے۔ "تلاش میر" اور "تلاش غالب" کے ساتھ "تلاش مصحفی" کی اشاعت بھی ان کے منصوبے میں شامل تھی۔ مصحفی پر فراق کا مضمون بلاشبہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن

مصحفی کی سوانح، حالات زندگی کے نشیب و فراز اور شعری متن کے استناد وغیرہ کے تعلق سے نثار احمد فاروقی کی تحریریں بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تحریریں ''برہان'' میں قسط وار شائع ہوتی رہیں۔ مصحفی پر ان کی تمام بکھری ہوئی تحریروں کو میں نے یکجا کرلیا ہے اور ان کی خواہش کے مطابق یہ تحریریں تلاش مصحفی کے نام سے کتابی شکل میں جلد ہی منظر عام پر آئیں گی۔

غالب کے نسخۂ امروہہ کی دریافت اور اس پر ان کے مقدمے سے ایک ہنگامی صورت حال پیدا ہوئی تھی مگر مجموعی طور پر وہ اپنی علمی وضع داری کے ساتھ تحقیقی کام کرتے رہے۔ بیشتر کلاسیکی موضوعات کے بنیادی اور ثانوی ماخذ انھیں ازبر تھے۔

نثار احمد فاروقی کی تحقیقی وتنقیدی کارگزاریوں سے دلچسپی ایک خاص ذوق اور ذہن کا تقاضہ کرتی ہیں ایسے میں انھیں کم یاد کرنا یا ان کا کم یاد آنا غیر متوقع نہیں، لیکن علمی وادبی اور خصوصاً دہلی کی ادبی فضا ان کے انتقال سے آج بھی سوگوار ہے۔ کوئی مسئلہ الجھتا تو لوگ کہتے تھے کہ نثار فاروقی کے بہت سے تحقیقی و تنقیدی نتائج اور محاکے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ محاکے تحقیق سہل پسندی اور جملہ بازی کی روش کو ختم کرسکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے پڑھنا ضروری ہے اور یہ کام کسی کے لیے کوئی دوسرا شخص نہیں کرسکتا کیوں کہ معاصر ادبی منظرنامہ تنقیدی اعتبار سے اب زیادہ علمی اور منطقی ہوگیا ہے۔ نئے تنقیدی نظریات نے پرانے تصورات کو سوالات کی زد میں لاکھڑا کیا ہے۔ کتابیں پہلے سے زیادہ اچھی اور دیدہ زیب شائع ہونے لگی ہیں۔ تحریری اور زبانی طور پر اظہار خیال کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے۔ لیکن نثار احمد فاروقی کی تحقیقی وتنقیدی کارگزاریاں اس نئے ماحول میں بھی ہماری ذہنی وفکری تربیت کا سامان فراہم کرسکتی ہیں۔

□□□

Deptt. of Urdu, JMI, Jamia Nagar,
Okhla, New Delhi-110025

بہادری کے کارنامے

مصنف: منوج داس/ مترجم: ایس. ایم. احمد

ہمارے ملک کو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے لاتعداد قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ جن سورماؤں نے اپنی جان آزادیِ وطن کے لیے نچھاور کی، ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں جدوجہدِ آزادی کے ابتدائی دور کے ایسے ہی بہادر سپوتوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 83، قیمت -/25 روپے

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی

مرتب: ڈاکٹر وشوامترا اپادھیائے/ مترجم: احسان احمد صدیقی

مادرِ وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے والوں میں مشہور انقلابی رام پرشاد بسمل سرِ فہرست ہیں۔
یہ آپ بیتی انھوں نے گورکھپور جیل میں اپنی پھانسی سے دو دن پہلے مکمل کی تھی۔ جدوجہد آزادی کے اس دور کی حقیقی تصویرکشی کے سبب یہ آپ بیتی دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 109، قیمت -/33 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دهلی کی جانب سے طلبه اور اساتذه کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی هے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب هے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

شکیل اختر

اردو اخبارات کے لسانی و تہذیبی سروکار

ہندوستان میں اردو صحافت نے ایک ایسے دور میں آنکھیں کھولیں جب پورا ملک ایک زبردست سیاسی، سماجی اور تہذیبی بحران سے دوچار تھا۔ ہندوستان مکمل طور پر انگریزوں کی نوآبادی بن چکا تھا۔ سیاسی کشمکش کے ساتھ ہی ہندوستان میں لسانی اور تہذیبی کشمکش کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ مغربی تہذیب نے ہندوستانی تہذیب کے دروازوں پر بھی دستک دی۔ بعض علاقوں میں اس کی بازگشت بھی سنائی دی جس کے نتیجے میں ہندوستان کے مختلف حصوں میں سماجی اور مذہبی اصلاحات کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ اس کشیدہ ماحول میں اردو صحافت نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں بال و پر نکالے، کہیں اس نے حکومت وقت سے لوہا لیا تو کہیں اس کی ہمنوائی کی۔ اس طرح انیسویں صدی کے اختتام تک ہندوستان میں خاصی تعداد میں اخبارات شائع ہونے لگے۔ ان اخبارات کا موضوعی مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ان میں سیاسی خبروں کے ساتھ ساتھ معاشرتی خبریں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ ان اخبارات میں سے بعض نے ملک کی تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دیا۔ یہ اخبارات نہ صرف اس دور کے سیاسی حالات کے آئینہ دار ہیں بلکہ اس وقت کی معاشرت اور تہذیب کے بھی امین ہیں۔ شمالی ہند ہو یا جنوبی ہند، وہاں کی معاشرتی فضا کو سمجھنے کے لیے ان علاقوں کے اخبارات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ تقریباً سبھی اخبارات میں اس طرح کا مواد ملتا ہے۔ صحافت کا ایک پہلو اس کی زبان ہے۔ مختلف ادوار کے اخبارات کی زبان نشان دہی کرتی ہے کہ کس علاقے میں کس طرح کی زبان استعمال ہوتی ہے اور عوام میں کس طرح کے الفاظ رائج ہیں۔

ہندوستان میں اردو صحافت کا آغاز اخبار ''جامِ جہاں نما'' سے ہوتا ہے۔ یہ اردو صحافت کا ابتدائی دور ہے جس پر داستانوی نثر کا اثر نظر آتا ہے۔ بعض اخبارات منظوم خبریں شائع کرتے تھے، لیکن نثری خبروں میں اس دور کی زبان کے خدوخال دیکھے جاسکتے ہیں۔ اخبار ''طلسم سحر سامری'' اور ''کوہ نور'' بعض خبریں منظوم شائع کی ہیں۔ ''کوہ نور'' لاہور نے 12 فروری 1877 کی اشاعت میں موسم کی خبر کس طرح شائع کی ہے، آپ بھی ملاحظہ کریں:

شکر ہے لاہور میں بھی ابرباراں ہوگیا
آج کل پنجاب بارش سے گلستاں ہوگیا
بلبلیں فرحت سے گاتی ہیں یہ مصرع بے بدل
غنچۂ پژمردہ تھا اے لو آج خنداں ہوگیا
ایسی بارش ہوگئی جو کھیتیوں کو ہے مفید
زندگی کا اے غریبو! اب تو ساماں ہوگیا

منظوم خبروں کے ساتھ ہی نثری خبروں میں بھی زبان کے اتار چڑھاؤ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ 1857 کے آس پاس شائع ہونے والے اردو اخبارات میں زبان پر داستانوی رنگ غالب ہے۔ خبریں اس انداز سے تحریر کی جاتی تھیں جیسے کوئی کہانی بیان کر رہا ہے اور ان میں داستانوں جیسی فضا بندی بھی ہوتی تھی۔ اس وقت فارسی، درباری زبان تھی۔ اس وجہ سے اردو نثر میں فارسی الفاظ کا استعمال بھی کثرت سے ملتا ہے جس کی وجہ سے صحافت کی زبان کو ترقی کرنے میں دشواری پیش آئی۔ دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اس بات کی کوشش نہیں کی گئی کہ صحافت کی زبان کو کس طرح عام اردو نثر سے الگ رکھا جائے۔ لیکن جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں سرکاری زبان فارسی کے بجائے اردو ہوگی تو اردو پر اس کے خوشگوار اثرات مرتب ہوئے۔

جس زمانے میں اردو کے یہ اخبارات جاری ہوئے وہ زمانہ سیاسی اور تہذیبی طور پر ہندوستان میں انحطاط کا زمانہ تھا۔ سیاسی اقتدار ہاتھوں سے نکل جانے کے بعد اب ہندوستانی تہذیب کا شیرازہ بھی بکھرنے لگا تھا۔ اخبار ''جامِ جہاں نما'' اس دور کی معاشرتی زندگی کا عکاس ہے۔ اس کے مدیر نے روزمرہ کی معاشرتی تبدیلیوں کو بھی اپنے اخبار میں جگہ دی ہے، جس سے اس دور کی معاشرت اور زبان دونوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں دہلی میں مشترکہ تہذیب کی ایک نشانی ''پھول والوں کی سیر'' تھی، جس میں ہندو مسلمان سبھی جوش و خروش سے حصہ لیتے تھے اور عالم پناہ اور جہاں پناہ جیسے القاب رکھنے والے بادشاہ بھی۔ اخبار ''جام جہاں نما'' نے اپنے 5 اکتوبر 1825 کے شمارے میں ''پھول والوں کی سیر'' سے متعلق ایک رپورٹ شائع کی، آپ بھی ملاحظہ کریں:

''پھول والوں کے میلے کی تقریب سے جب حضرت جہاں پنا (اکبر شاہ ثانی والد بہادر شاہ ظفر) قطب شاہ کی درگاہ میں رونق افروز ہوتے تھے، اکثر سواری جھولنے پر جاتی تھی۔ حضرت راگ سنتے اور زنانے بندوبست میں نہانے کا تماشہ دیکھتے۔ خواصیں کس کس خوبی سے آپس میں لڑتیاں۔ کوئی مسکرا کے بالوں کو نچوڑتی۔ کوئی شرما انگیاں مروڑتی۔ ایک ایک کی کرتی چاک کرتی۔

دوسری شرم سے انگلی دانتوں میں پکڑتی۔ کوئی پکارتی بوا بتاؤ میں نہ جاؤ وہاں بڑا زور ہے۔ کوئی للکارتی، دوگانہ چڑھاؤ۔ پڑاؤ دیکھو تو کیا نور ہے۔ گر انھیں پیکروں کی چھیڑ چھاڑ اور آپس میں اختلاط کی مار دھاڑ جنھوں نے دیکھا وہی جانتے ہیں، لکھنے سے کیا فائدہ سننے والے کیا کچھ سچ جانیں گے۔''

یہ ''جامِ جہاں نما'' کی صرف ایک خبر ہی نہیں ہے، سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد دلی کی زوال آمادہ تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی عکاس بھی ہے۔ ''جامِ جہاں نما'' معنوی اعتبار سے واقعی جامِ جم تھا۔ مدیر کلکتہ میں ترسیل و ابلاغ کے ذرائع نہایت کمزور ہیں اس کے باوجود سیاسی خبروں کے ساتھ ساتھ معاشرت اور تہذیب پر بھی مدیر کی نظر ہے اور ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ 22 مارچ 1825 کے شمارے کی ایک خبر دیکھیں:

''نواب معتمد الدولہ نے مسیتا بیگ کوتوال کو حکم دیا کہ جتنی لونڈیاں شہر میں ہیں انھیں حضور کی ڈیوڑھی پر حاضر کیا کرو۔''

یہ چھوٹی سی خبر لکھنؤ کی اس وقت کی معاشرتی فضا کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ زبان بھی شمالی ہند کے اخباروں کی خبروں کے مقابلے میں صاف اور سلیس ہے۔ ''جامِ جہاں نما'' ہندوستانی تہواروں سے متعلق خبریں بھی شائع کرتا تھا۔ دلی میں دیوالی کس طرح منائی جاتی تھی اور مغل سلاطین اس میں کس اہتمام سے شرکت کرتے تھے، اس کا حال سنیے:

''حضرت حمام میں رونق افروز ہوئے۔ کچھوے کی پیٹھ پر بیٹھ چراغ دہلی کی درگاہ کے پانی سے موافق دستور کے دیوالی کی تقریب کا غسل کر، پوشاک بدل، خاص تراشوں کو انعام دے، محل میں داخل ہوئے اور حکم صادر ہوا کہ آج دیوالی کا دن ہے۔ موافق دستور کے محل اور قلعے کے دروازوں پر چراغاں کی روشنی کرو۔'' (31 نومبر 1825)

اس اقتباس سے اس دور کے تہذیبی ہی نہیں نثری رجحان کا پتہ بھی چلتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب فورٹ ولیم کالج کے قیام کو 25 برس گزر چکے ہیں، میر امن کی ''باغ و بہار'' کو عوام میں مقبولیت حاصل ہو رہی ہے اور اردو پر فارسی کے اثرات کم ہو رہے ہیں۔

اردو کے ابتدائی دور کے اخبارات میں اصلاحی رجحانات زیادہ نظر آتے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہ اس بحرانی دور میں مشترکہ تہذیب کی علامتوں کے زندہ ہونے کا احساس کراتا ہے۔ اس دور کے بیشتر اخبارات نے دہلی اور لکھنؤ کی تہذیبی زندگی کو اپنے صفحات پر جگہ دی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی دور کے اخبارات کا سروکار شعوری یا غیر شعوری طور پر ہماری تہذیبی زندگی سے رہا ہے۔

آئیے ایک نظر ڈالتے ہیں بیسویں صدی کے اوائل کے ایک اردو اخبار پر جسے قارئین نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور جو ایک قوم پرست اخبار تھا۔ اس اخبار کو ہم اور آپ ''مدینہ'' کے نام سے جانتے ہیں۔ جو بجنور سے نکلتا تھا۔ ''مدینہ'' کے صفحات سیاسی خبروں بشمول اخلاقیات، ادب، اور تہذیب و ثقافت کے لیے مختص تھے۔ ان موضوعات پر خبریں اور مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس اخبار نے اس وقت کی تہذیبی کشمکش کو منظوم مکالماتی انداز میں بھی پیش کیا ہے۔ 15 اگست 1912 کے شمارے میں خبروں کے کالم میں ایک نظم شائع کی گئی ہے جس میں مغربی تہذیب کی آمد اور مشرقی تہذیب کے بکھرتے شیرازے کو دکھایا گیا ہے۔ مغربی تہذیب کی نمائندہ جولیا، مشرقی تہذیب کی نمائندہ بدرالنسا پر کس طرح حملہ کرتی ہے، چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کہا جولیا نے یہ بدرالنسا سے
کہ موجودہ تہذیب سے تم ہو عاری
نیا کوئی انداز تم میں نہیں ہے
پرانی ہے ساری آرائش تمھاری
سمجھتی ہو زیور کو زینت کا ساماں
خوشی سے اٹھاتی ہو یہ بوجھ بھاری
بناوٹ سے تم چاہتی ہو چپکنا
لگاتی ہو کپڑوں پہ گوٹا کناری

یہ ایک طویل نظم ہے جس میں دونوں نسوانی کردار مکالمہ کرتے ہیں اور اپنی اپنی تہذیب کو بہتر طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس نظم سے اس دور کے تہذیبی رویوں اور ذہنی کشمکش کا اظہار ہوتا ہے۔

ہندوستانی صحافت میں اخبار ''زمیندار'' کا اجرا ایک خوش آئند قدم تھا۔ اس اخبار نے ہندوستان میں اصلاحی تحریک، بالخصوص مسلمانوں کے زمیندار طبقے میں تعلیم و تہذیب کو عام کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس اخبار کی زبان اس کے ہم عصر اخبارات کی زبان سے بہتر ہے۔ اخبار کا خاص مشن مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف آواز بلند کرنا اور معاشرتی اصلاح کرنا تھا۔ اس اخبار کے 14 اگست 1912 کے شمارے کا ایک اندراج دیکھیے:

''اب ہمارے ثقہ معتبر نامہ نگار صاحب آگرہ سے اطلاع دیتے ہیں کہ ڈاکٹر مودی کے علاوہ ایک بنگالی پروفیسر صاحب بھی جن کا نام نامی چندر موہن ڈے ہے، مسلمان متعلمین پر ستم ناروا توڑنے میں خاص مشق و مہارت رکھتے ہیں۔ آپ نے اسی خصوصیت کی وجہ سے آگرہ میں خوب شہرت حاصل کر لی ہے۔ حال میں اسکول کے قواعد و ضوابط میں جو اضافہ ہوا ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ مسلمان متعلمین پر کس درجہ زیادتی کی گئی ہے۔ لباس کے متعلق ہدایت کی گئی ہے کہ اسکول کے انعامی اور دیگر جلسوں میں ترکی ٹوپی پہن کر

شریک نہ ہوں۔''

اس اقتباس کو یہاں پیش کرنے کا مقصد اس دور کے ہندوستانی معاشرے میں موجود مذہبی کشیدگی کی نشان دہی کرنا ہے جو ہماری قومی روایت کے منافی سہی لیکن جس نے ہمارے معاشرے میں قدم جمانے شروع کر دیے تھے۔ ان اخبارات کے علاوہ ''تہذیب الاخلاق''، ''اودھ پنچ''، ''پیسہ''، ''اردوئے معلی''، ''ہمدرد''، ''الہلال'' ''البلاغ'' جیسے اخبارات نے زبان اور تہذیب کے حوالے سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہر اخبار کے حوالے سے گفتگو کرنی مشکل ہے۔ مذکورہ اخبارات وہ ہیں جن کا اردو صحافت اردو زبان و تہذیب کے فروغ میں خاص حصہ رہا ہے۔

اردو صحافت کا مولد و مرکز دکن بھی رہا ہے۔ دکن کی تہذیب، تمدن، زبان اور زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے وہاں کے اخبارات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ وہاں کے قدیم اخبارات میں ''سفیر دکن''، ''اخبار آصفی''، ''افسر الاخبار''، ''خورشید دکن''، جریدہ الاعلامیہ' اور' ہزار داستان' نہایت اہم ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان، بالخصوص شمالی ہندوستان کی تہذیب جس بحران کا شکار ہوئی اس کی تلافی اب تک نہیں ہو سکی ہے۔ کثیر تعداد میں تعلیم یافتہ حضرات وطن عزیز سے ہجرت کر گئے، اردو کے حوالے سے شمالی ہند میں جس تعصب کو ہوا دی گئی اس کے اثرات دور رس ثابت ہوئے۔ آج شمالی ہندوستان سے شائع ہونے والے اردو اخبارات پر ہندی کا زیادہ اثر ہے۔ یہ اثر عام زندگی پر بھی ہے۔ گذشتہ صدی کے نصف آخر میں کوئی نامور صحافی پیدا نہ ہو سکا۔ شمالی ہندوستان میں 1947 کے بعد شائع ہونے والے اردو اخبارات کا اپنے قارئین کے ساتھ لسانی، تہذیبی اور فکری رشتہ بہت کمزور رہا ہے۔ اس پورے خطے کا ایک بھی اردو اخبار نہیں ہے جس نے رائے عامہ کو ہموار کیا ہو۔ زبان کے حوالے سے موجودہ دور کے اخبارات میں انگریزی الفاظ اور ہندی تراکیب کا استعمال بے دریغ ہو رہا ہے۔ دہلی سے کچھ روزنامے بڑے بینر سے شائع ہو رہے ہیں لیکن ان اخبارات کا دہلی کی لسانی اور تہذیبی اقدار سے کس حد تک واسطہ ہے سبھی جانتے ہیں۔ زبان و بیان کی غلطیوں سے قطع نظر املا کی غلطیاں بھی عام ہیں۔ میرا مقصد ان غلطیوں پر محض اظہار تاسف کرنا ہی نہیں اس اہم فریضے پر زور دینا بھی ہے کہ ہم سب مل کر ان عوامل کی نشاندہی کریں جن کی وجہ سے آج اردو صحافت، زبان اور تہذیبی سروکار کے سلسلے میں اپنے قارئین سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اخبار ہو یا نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع سب جگہ زبان اور کلچر کے حوالے سے یکساں صورتحال ہے۔ یہ صورتحال کس طرح بدل سکتی ہے اس پر سوچنا اور اس کے لیے عملی قدم اٹھانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

□□□

پتہ: Producer, Jamia Community Radio 90.4,
A.J.K. Mass CRC, JMI, Jamia Nagar, Okhla, N.Delhi 25

آندھی (منظر نامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظر نامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایسا سلسلہ کہا جا سکتا ہے جو کہانی کا روپ دھارن کر لے۔ فلم ''آندھی'' کا یہ منظر نامہ کملیشور کے ناول ''کالی آندھی'' پر مبنی ہے اور اس کا اسکرین پلے، مکالمے اور گیت گلزار کے قلم سے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ مجموعی دلچسپی کا باعث بھی ہوگا لیکن اس کی اشاعت کا ایک مقصد ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی بھی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا مستقبل بنانے کی خواہش مند ہیں۔

صفحات: 122، قیمت -/65 روپے

جدید سیاسی فکر

مصنف: ڈاکٹر سید انوار الحق حقی، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

اس کتاب میں جدید سیاسی فکر کے پس منظر کے ساتھ ساتھ ان تمام سیاسی فلسفیوں پر گفتگو کی گئی ہے جنھوں نے اس مدت میں عالمی سیاست پر اثر ڈالا اور مختلف حکومتی نظاموں کی تشکیل یا استرداد دونوں کا موجب بنے۔ قدامت پسندی، افادہ پسندی، عینیت، ثبوتیت، قانونیت، اشتراکیت اور اس کے مختلف مکاتب فکر، سیاسی تکثیریت، مملکت مخالف نظریات، جمہوریت مخالف نظریات، مہاتما گاندھی کا عدم تشدد کا نظریہ اور سرودیہ تحریک — یہ کتاب ان تمام عنوانات پر سیر حاصل روشنی ڈالتی ہے۔

صفحات: 305، قیمت -/120 روپے

پیغمبر اسلام کو منظوم خراجِ عقیدت

اردو کے مشہور شاعر اور قومی اردو کونسل نئی دہلی کے وائس چیئرمین چندر بھان خیال پچھلے دنوں بھوپال آئے تو ہمارے نمائندے نے ان سے ملاقات کی۔ خیال صاحب کی طویل نظم 'لولاک' کا علمی اور ادبی حلقوں میں ان دنوں خاصا چرچا ہے۔ اس نظم میں خیال صاحب نے پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی زندگی، تعلیمات اور انسانیت کے نام ان کے مقدس پیغام کو شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ ان کا یہ کارنامہ شعری محاسن کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت محمدؐ کے تئیں ان کی پرجوش والہانہ عقیدت کا بھی اظہار ہے۔

''لولاک'' میں جو ایک منفرد اسلوب کی حامل نظم ہے، جس میں حضرت محمدؐ کی ولادت سے وفات تک کے تمام اہم واقعات، ان کے غزوات اور ان کی تعلیمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب 128 صفحات پر مشتمل ہے۔ سیرت رسول کو شعری جامہ پہنانا آسان کام نہیں تھا، خیال صاحب کہتے ہیں کہ انھیں اوائل عمر ہی سے حضرت محمدؐ کی ذات میں ایک کشش محسوس ہوتی رہی ہے اور یہ اسی جذبے کا فیضان ہے کہ انھیں یہ نظم لکھنے کی توفیق ہوئی اور یہ مشکل کام تائید خداوندی سے ان کے لیے آسان ہوگیا۔ مختصری مدت میں اس کتاب کے اب تک تین ایڈیشن نکل چکے ہیں، اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

بھوپال میں 14 جون کو ہونے والے ایک سیمینار میں شرکت کے لیے آئے جناب چندر بھان خیال نے کہا کہ ابتدا میں وہ قدرے تذبذب میں تھے کہ اس مشکل کام کو وہ پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں گے یا نہیں، وہ اپنا احتساب کر رہے تھے کہ اس عظیم ہستی کے بارے میں جس کی تعریف و توصیف خود خالق کائنات نے کی ہے، وہ لب کشائی کی جرأت کریں کہ نہ کریں لیکن دل نے کہا کہ یہ جرأت موجب سعادت ہوگی اور یہ سعادت مجھے حاصل ہوگئی۔ خیال صاحب نے مزید کہا کہ جب نظم مکمل ہوگئی تو انھوں نے دیوبندی اور بریلوی دونوں مسلکوں کے علما کو دکھائی، جب انھوں نے نظم پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تو پھر میں نے نظم ادبی حلقے کے دوستوں کو بھی دکھائی۔ ان کا ردِعمل بھی تحسین آمیز تھا۔ اس سے مجھے اطمینان بھی ہوا اور خوشی بھی۔

نظم کی ابتدا حضرت محمدؐ کی پیدائش سے قبل عرب میں پائے جانے والے حالات سے ہوئی ہے۔ نظم جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے، حضرت کی ذاتی زندگی کے گوشے اور ان کی تعلیمات روشن ہوتی جاتی ہیں۔ آپؐ نے اپنے آخری حج کے موقع پر جو خطبہ دیا تھا اور جسے صحیح معنوں میں انسانیت کا منشور کہا جاسکتا ہے، اس کی منظوم ترجمانی پر، جو انتہائی موثر پیرائے میں کی گئی ہے، نظم اپنے اختتام کو پہنچتی ہے۔

یہ نظم جو خیال صاحب کے بیان کے مطابق تیرہ برس میں مکمل ہوئی ہے، یوں تو ایک مسلسل نظم ہے لیکن قارئین کی سہولت کے لیے اسے چھ ابواب میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ ہر باب حضرت محمدؐ کی زندگی کے ایک معینہ دور سے تعلق رکھتا ہے۔

خیال صاحب نظم اور غزل دونوں اصناف پر عبور رکھتے ہیں مگر انھیں زیادہ دلچسپی نظم سے ہے۔ جدید اردو شاعری میں وہ اپنی مخصوص شعری لفظیات اور انوکھی تشبیہات اور استعارات کی وجہ سے اپنی امتیازی پہچان رکھتے ہیں۔ جنگل اور قبائلی ماحول کی جھلک اردو شاعری کو چندر بھان خیال ہی کی دین ہے۔ ''لولاک'' کے منظرعام پر آنے سے پہلے ان کے تین شعری مجموعے شائع ہوچکے تھے۔ ایک مجموعہ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ان کا آبائی وطن باہئی ضلع ہوشنگ آباد ہے۔ اردو زبان انھوں نے اردو ہندی سیلف ٹیچنگ کے ذریعے سیکھی کیوں کہ باہئی میں اردو تدریس کا انتظام نہیں تھا۔ دلی آکر انھوں نے پنڈت رام کرشن مضطر کی شاگردی میں شاعری کے فنی رموز و نکات کو سمجھا۔

ایک سوال کے جواب میں خیال صاحب نے کہا ''مجھے اس وقت بہت تکلیف ہوتی ہے جب مسلمانوں کو من حیث قوم دہشت گردی سے جوڑ دیا جاتا ہے جبکہ اسلامی تعلیمات میں دہشت گردانہ طرزِ عمل کا کوئی جواز نہیں بلکہ اسلام تو دہشت گردی کے خلاف جہاد کا حکم دیتا ہے۔ خیال صاحب نے کہا کہ ''لولاک'' کے ایک باب میں اسلامی جہاد کے تصور کو بھی واضح کیا گیا ہے کیونکہ عام رائے اس معاملے میں مبہم ہی نہیں گمراہ کن بھی ہے۔

خیال صاحب نے آخر میں قومی اردو کونسل کے حوالے سے کہا کہ کونسل اردو سکھانے کے کچھ اور مراکز کھولنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ہمیں ادب کے ساتھ ساتھ زبان کے فروغ کے لیے کام کرنا ہوگا جو بحالات موجود اولین اہمیت کا کام ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ، انگلی سطر بہ شکریہ ہندوستان ٹائمز، بھوپال، 15 جون 2009)

□□□

غزلیاتِ ولی دکنی

●

طالب نہیں مہر و مشتری کا   دیوانہ ہوا جو تجھ پری کا
یو غمزۂ شوخ، ساحری میں   استاد ہے سحر سامری کا
تجھ تل سوں اے آفتاب طلعت   ممنون ہوں ذرّہ پروری کا
کفار فرنگ کوں دیا ہے   تجھ زلف نے درس کافری کا
تیرا خطِ خضر رنگ اے شوخ   سلطان ہے خشکی و تری کا
توں سرسوں قدم تلک جھلک میں   گویا ہے قصیدہ انوری کا
خورشید ستی ہوا ہے ہم سر   چیرا، ترے سر اُپر، زری کا
اے غنچہ نہ کر تو فخر، یو دل   ہے بند پیا کی بکتری کا
پایا ہے جو کوئی دولتِ فقر   مشتاق نہیں سکندری کا
پھیکی لگے اس کوں شانِ دولت   چاکھیا جو مزہ قلندری کا
کہتا ہے ولی پکار یو بات   بندہ ہوں پیا کی دلبری کا

●

ترے مکھ پر اے نازنیں یو نقاب   جھلکتا ہے جیوں مطلع آفتاب
ادا فہم کے دل کی تسخیر کوں   ترا قد ہے جیوں مصرعِ انتخاب
بجا ہے ترے حسن کی تاب سوں   تری زلف کھاتی ہے گر پیچ و تاب
نظر کرکے تجھ مکھ کی صافی اُپر   ہوئی شرم سوں آرسی غرقِ آب
ترے عکس پڑنے سوں اے گل بدن   عجب نئیں اگر آب ہووے گلاب
ترے وصل میں اس قدر ہے نشاط   کہ مخمل کوں آئے سوں راحت خراب
کریں بخت میرے اگر ٹک مدد   ولی اُس سجن سوں ملوں بے حجاب

●

نکل اے دل رُبا گھر سوں کہ وقتِ بے حجابی ہے
چمن میں چل، بہارِ نستران ہے، ماہتابی ہے

کسی کی بات سنتا نئیں کسی پر رحم کرتا نئیں
ہٹیلا ہے، ستمگر ہے، جفا جو ہے، شرابی ہے

گیا ہے جب سوں وو گل رو چمن میں مے کشی کرنے
ہر اک گل صورتِ ساغر ہر اک غنچہ گلابی ہے

گلی میں اُس ستم گر کی نہ جا اے دل، نہ جا اے دل
کہ جاں بازی میں آفت ہے، قیامت ہے، خرابی ہے

کسے طاقت ہے انکھیاں کھول کر دیکھے تری جانب
جھلک تجھ حسنِ روشن کی شعاعِ آفتابی ہے

وفاداری بہارِ گلشنِ خوبی ہے اے گل رو
نہ بوجھو سرسری ہرگز سخن میرا کتابی ہے

ولی پایا رباعی چار ابرو کے تصوّر میں
تخلّص چشمِ گریاں کا بجا ہے گر سحابی ہے

●

موسیٰ اگر جو دیکھے تجھ نور کا تماشا
اس کوں پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا

اے رشکِ باغ جنت تجھ پر نظر کیے سوں
رضواں کو ہووے دوزخ پھر حور کا تماشا

روزِ سیاہ اس کے موموسوں جلوہ گر ہے
تجھ زلف میں جو دیکھا دیجور کا تماشا

کثرت کے پھول بَن میں جاتے نہیں ہیں عارف
بس ہے موحّداں کو منصور کا تماشا

ہے جس سوں یادگاری وو جلوہ گر ہے دایم
تو چیں میں دیکھ جاکر فغفور کا تماشا

وہ سر بلند عالم از بس ہے مجھ نظر میں
جیوں آسماں عیاں ہے مجھ دور کا تماشا

تجھ عشق میں ولی کے آنجھو اُمنڈ چلے ہیں
اے بحرِ حسن آ دیکھ اِس پوُر کا تماشا

□□□

غزلیاتِ سراج اورنگ آبادی

●

جان و دل سیں میں گرفتار ہوں، کن کا، اُن کا
بندۂ بے زر و دینار ہوں، کن کا، اُن کا

صبر کے باغ کے منڈوے سے جھڑا ہوں جیوں پھول
اب تو لاچار گلے ہار ہوں، کن کا، اُن کا

حوضِ کوثر کی نہیں چاہ، زنخداں کی قسم
تشنۂ شربتِ دیدار ہوں، کن کا، اُن کا

لب و رخسار کے گل قند سیں لازم ہے علاج
دل کے آزار سیں بیمار ہوں، کن کا، اُن کا

مدتیں ہوئیں کہ ہوا خانۂ زنجیر خراب
بستۂ زلفِ گرہ دار ہوں، کن کا، اُن کا

تشنۂ مرگ کوں ہے آبِ صُراحی دم تیغ
بسملِ ابروئے خمدار ہوں، کن کا، اُن کا

ناحق اس سنگدلی سیں مجھے دیتے ہیں شکست
میں تو آئینۂ سرکار ہوں، کن کا، اُن کا

گلشنِ وصل میں رہتا ہوں غزل خوانِ فراق
عندلیب گل رخسار ہوں، کن کا، اُن کا

میں کہا رحم پتنگوں پہ کر اے جانِ سراج
تب کہا، شمع شب تار ہوں، کن کا، اُن کا

●

جب سیں دیا ہے شوخ نے کاکل کوں پیچ و تاب
آیا ہے اس کے رشک سیں سنبل کوں پیچ و تاب

اس گلبدن کے نشترِ مژگاں کوں دیکھ کر
آیا ہے جوشِ خوں سیں رگِ گل کوں پیچ و تاب

کیوں آسکے بیان میں اس موکمر کے وصف
جس فکر نے دیا ہے تامّل کوں پیچ و تاب

ہوتا ہے دامِ لطف ستی بند صید دل
مت دے بھوؤں پہ چین تغافل کوں پیچ و تاب

مائل ہوا ہے جب سیں وو گل رو کا اے سراج
ہے بوئے گل کی موج سے بلبل کوں پیچ و تاب

●

کہاں ہے گلبدن موہن پیارا
کہ جیوں بلبل ہے نالاں دل ہمارا

بساطِ عشق بازی میں مرا دل
متاعِ صبر و نقد و ہوش ہارا

تغافل ترک کر اے شوخ بے باک
تلطف کر، نوازش کر، مدارا

ہزارے کا نہیں ہے ذوق مجکوں
کیا ہوں جب سیں تجھ کا نظارا

سُنا ہے جب سیں تیرے حُسن کا شور
لیا زاہد نے مسجد کا کنارا

شب ہجرت میں اس مہتاب رُو کی
ہر ایک آنسو ہوا روشن ستارا

سراج اس شمع رُو نے ان دنوں میں
لیا ہے سب پتنگوں کا اجارا

●

کیا غم نے سرایت بے نہایت
کروں کس سیں شکایت بے نہایت

ہمارے قتل پہ مفتی نے غم کے
نکالا ہے روایت بے نہایت

توں اپنے غمزۂ خونیں کی ظالم
عبث مت کر حمایت بے نہایت

ترے رُخ پر ہجومِ خال و خط ہے
کہ ہیں مصحف میں آیت بے نہایت

کیا ہے عشق کے ہادی نے مجھ کوں
محبت کی ہدایت بے نہایت

شکر لب نے نگاہِ دلبری سیں
کیا مجھ پر عنایت بے نہایت

سراج اب داستانِ شوق بس کر
کہ بے جا ہے حکایت بے نہایت

□□□

میر امن دہلوی

سیر تیسرے درویش کی

تیسرا درویش گوٹ باندھ بیٹھا اور اپنی سیر کا بیان اس طرح سے کرنے لگا۔

اَحوال اس فقیر کا اے دوستاں سُنو!
یعنی جو مجھ پہ بیتی ہے وہ داستاں سُنو!
جو کچھ کہ شاہِ عشق نے مجھ سے کیا سلوک
تفصیل وار کرتا ہوں اُس کا بیاں، سُنو!

کہ یہ کم ترین بادشاہ زادہ عجم کا ہے۔ میرے ولی نعمت دہاں کے بادشاہ تھے اور سوائے میرے کوئی فرزند نہ رکھتے تھے۔ میں جوانی کے عالم میں مُصاحبوں کے ساتھ چَوپڑ، گنجفہ، شطرنج، تختہ نَرد کھیلا کرتا یا سوار ہوکر سیر و شکار میں مشغول رہتا۔ ایک دن کا یہ ماجرا ہے کہ سواری تیار کروا کر اور سب یار آشناؤں کو لے کر میدان کی طرف نکلا۔ باز، بَہری، جُرّہ، باشا، سُرخاب اور تیتروں پر اُڑاتا ہوا دور نکل گیا۔ عجب طرح کا ایک قطعہ بہار کا نظر آیا کہ جیدھر نگاہ جاتی تھی، کوسوں تلک سبزا اور پھولوں سے لعل زمین نظر آتی تھی۔ یہ سماں دیکھ کر گھوڑوں کی باگیں ڈال دیاں اور قدم قدم سیر کرتے ہوئے چلے جاتے تھے۔ ناگاہ اُس صحرا میں دیکھا کہ ایک کالا ہرَن، اُس پر زربفت کی جھول اور جڑاؤ کلی مُرصّع کی اور گھونگرو سونے کے زردوزی پٹے میں ٹکے ہوئے گلے میں پڑے، خاطر جمع سے اُس میدان میں (کہ جہاں انسان کا دخل نہیں اور پرندہ پَر نہیں مارتا) چَرتا پھرتا ہے۔ ہمارے گھوڑوں کے سُم آہٹ پا کر چونکا ہوا اور سر اُٹھا کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلا۔

مجھے اُس کے دیکھنے سے یہ شوق ہوا کہ رفیقوں سے کہا کہ تم یہیں کھڑے رہو، میں اُسے جیتا پکڑوں گا۔ خبردار! تم قدم آگے نہ بڑھائیو اور میرے پیچھے نہ آئیو۔ اور گھوڑا میری رانوں تلے ایسا پَرندتھا کہ بار ہا ہرنوں کے اوپر دوڑا کر اُن کی کَر چھالوں کو بھلا کر ہاتھوں سے پکڑ پکڑ لیے تھے؛ اُس کے عقب دوڑایا۔ وہ دیکھ کر چھلانگیں بھرنے لگا اور ہوا ہوا۔ اور گھوڑا بھی باد سے باتیں کرتا تھا لیکن اُس کی گرد کو نہ پہنچا۔ وہ رَہوار بھی پسینے پسینے ہوگیا اور میری بھی جیبھ مارے پیاس کے چٹخنے لگی، پر کچھ بس نہ چلا۔ شام ہونے لگی اور میں کیا جانوں کہاں سے کہاں نکل آیا؟ لاچار ہوکر اُسے بھلاوا دیا۔ اور ترکش میں سے تیر نکال کر اور قُربان سے کمان سنبھال کر چلّے میں جوڑ کر کَشش کان تلک لا کر ران کو اُس کی تاک، اللہ اکبر کہہ کر مارا۔ بارے پہلا ہی تیر اُس کے پانو میں ترازو ہوا تب لنگڑاتا ہوا پہاڑ کے دامن کی سمت چلا۔ فقیر بھی گھوڑے پر سے اُتر پڑا اور پاپیادہ اُس کے پیچھے لگا۔ اُس نے کوہ کا ارادہ کیا اور میں نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ کئی اُتار چڑھاو کے بعد ایک گنبد نظر آیا۔ جب پاس پہنچا، ایک باغچہ اور ایک چشمہ دیکھا۔ وہ ہرَن تو نظروں سے چھلاوا ہوگیا۔ میں نہایت تھکا تھا، ہاتھ پانو دھونے لگا۔

ایک بارگی آواز رونے کی اُس بُرج کے اندر سے میرے کان میں آئی، جیسے کوئی کہتا ہے کہ اے بچے! جس نے تجھے تیر مارا، میری آہ کا تیر اُس کے کلیجے میں لگیو! وہ اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے اور خدا اس کو میرا سا دُکھیا بناوے! میں یہ سُن کر وہاں گیا۔ دیکھا تو ایک بُزرگ ریش سفید اچھی پوشاک پہنے ایک مسند پر بیٹھا ہے اور ہرن آگے لیٹا ہے؛ اُس کی جانگ سے یہ تیر کھینچتا ہے اور بددُعا دیتا ہے۔ میں نے سلام کیا اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ حضرت سلامت! یہ تقصیر نادانستہ اس غلام سے ہوئی، میں یہ نہ جانتا تھا، خدا کے واسطے مُعاف کرو۔ بولا کہ بے زبان کو تو نے ستایا ہے، اگر اَن جان یہ حرکت تجھ سے ہوئی، اللہ معاف کرے گا۔ میں پاس جا بیٹھا اور تیر نکالنے میں شریک ہوا۔ بڑی دِقّت سے تیر کو نکالا اور زخم میں مرہم بھر کر چھوڑ دیا۔ پھر ہاتھ دھو دھا کر اُس پیر مرد نے کچھ حاضری جو اُس وقت موجود تھی، مجھے کھلائی۔ میں نے کھا پی کر ایک چارپائی پر لنبی تانی۔

ماندگی کے سبب خوب پیٹ بھر کر سویا۔ اُس نیند میں آواز نوحہ وزاری کی کان میں آئی۔ آنکھیں مل کر جو دیکھتا ہوں تو اُس مکان میں نہ وہ بوڑھا ہے نہ کوئی اور ہے، اکیلا میں پلنگ پر لیٹا ہوں اور وہ دالان خالی پڑا ہے۔ چاروں طرف بھَیا نک ہوکر دیکھنے لگا۔ ایک کونے میں پردہ پڑا نظر آیا۔ دہاں جا کر اُسے اُٹھایا۔ دیکھا تو ایک تخت بچھا ہے اور اس پر ایک پری زاد عورت، برس چودہ ایک کی، مہتاب کی سی صورت اور زُلفیں دونوں طرف چھوٹیں ہوئیں، ہنستا چہرہ، فرنگی لِباس پہنے ہوئے عجب ادا سے دیکھتی ہے اور بیٹھی ہے اور وہ بُزرگ اپنا سر اُس کے پانو پر دھرے بے اختیار رو رہا ہے اور ہوش حواس کھو رہا ہے۔ میں اُس پیر مرد کا یہ احوال اور اُس نازنین کا حُسن و جمال دیکھ کر مُرجھا گیا اور مُردے کی طرح بے جان ہوکر گر پڑا۔ وہ مردِ بُزرگ یہ میرا حال دیکھ کر شیشہ گُلاب کا لے آیا اور مجھ پر چھڑکنے لگا۔ جب میں جیتا اُٹھ کر اُس معشوق کے مقابل جا کر سلام کیا؛ اُس نے ہرگز نہ ہاتھ اُٹھایا اور نہ ہونٹھ ہلایا۔ میں نے کہا: اے گُل بدن! اتنا غرور کرنا اور جواب سلام کا نہ دینا کس مذہب میں دُرست ہے؟

کم بولنا ادا ہے ہر چند، پر نہ اتنا
مُند جائے چشمِ عاشق تو بھی وہ منہ نہ کھولے

واسطے اُس خدا کے جس نے تجھے بنایا ہے، کچھ تو مُنہ سے بول۔ ہم بھی اِتفاقاً یہاں آنکلے ہیں، مہمان کی خاطر ضرور ہے۔ میں نے بہتیری باتیں بنائیں لیکن کچھ کام نہ آئیں۔ وہ چپکی بُت کی طرح بیٹھی سُنا کی۔ تب میں نے

بھی آگے بڑھ کر ہاتھ پانو پر چلایا۔ جب پانو کو چھیڑا تو سخت معلوم ہوا۔ آخر یہ دریافت کیا کہ پتھر سے اِس لعل کو تراشا ہے اور آزر نے اِس بُت کو بنایا ہے۔ تب اُس پیر مرد بُت پرست سے پوچھا کہ میں نے تیرے ہرن کی ٹانگ میں کھپرا مارا، تو نے اِس عشق کی ناوک سے میرا کلیجا چھید کر وار پار کیا۔ تیری دُعا قبول ہوئی۔ اب اس کی کیفیت مُفصّل بیان کر کہ یہ طِلسم کیوں بنایا ہے اور تو نے بستی کو چھوڑ کر جنگل پہاڑ کیوں بسایا ہے؟ تجھ پر جو کچھ بیتا ہے، مجھ سے کہہ۔

جب اُس کا بہت پیچھا لیا، تب اُس نے جواب دیا کہ اس بات نے مجھے تو خراب کیا، تو بھی سُن کر ہلاک ہوا چاہتا ہے؟ میں نے کہا: لو اب بہت مکر چکر کیا، مطلب کی بات کہو، نہیں تو مار ڈالوں گا۔ مجھے نہایت درپے دیکھ کر بولا: اے جوان! حق تعالیٰ ہر ایک انسان کو عشق کی آنچ سے محفوظ رکھے۔ دیکھ تو اس عشق نے کیا کیا آفتیں برپا کی ہیں! عشق ہی کے مارے عورت، خاوند کے ساتھ ستی ہوتی ہے اور اپنی جان کھوتی ہے۔ اور فرہاد و مجنوں کا قِصہ سب کو معلوم ہے۔ تو اُس کے سُننے سے کیا پھل پاوے گا؟ ناحق گھر بار، دولتِ دُنیا چھوڑ چھاڑ کر نِکل جاوے گا۔ میں نے جواب دیا: بس اپنی دوستی تہ کر رکھو، اس وقت مجھے اپنا دشمن سمجھو۔ اگر جان عزیز ہے تو صاف کہو۔ لاچار ہو کر آنسو بھر لایا اور کہنے لگا کہ مجھ خانہ خراب کی یہ حقیقت ہے کہ بندے کا نام نُعمان سیّاح ہے۔ میں بڑا سوداگر تھا۔ اِس سن میں تجارت کے سبب ہفت اقلیم کی سیر کی اور سب بادشاہوں کی خدمت میں رسائی ہوئی۔

ایک بار یہ خیال جی میں آیا کہ چاروں دانگ مُلک تو پھرا لیکن جزیرۂ فرنگ کی طرف نہ گیا اور وہاں کے بادشاہ کو اور رعیت و سپاہ کو نہ دیکھا اور رسم و راہ وہاں کی کچھ نہ دریافت ہوئی؛ ایک دفعہ وہاں بھی چلا چاہیے۔ رفیقوں اور شفیقوں سے صلاح لے کر ارادہ مصمم کیا اور تحفہ، ہدایا جہاں تہاں کا، جو وہاں کے لائق تھا، لیا اور ایک قافلہ سوداگروں کا اِکٹھا کر کر جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ ہوا جو مُوافق پائی، کئی مہینوں میں اُس مُلک میں جا داخل ہوا۔ شہر میں ڈیرا کیا۔ عجب شہر دیکھا کہ کوئی شہر اس شہر کی خوبی کو نہیں پہنچتا۔ ہر ایک بازار و کوچے میں پختہ سڑکیں بنی ہوئیں اور چھڑکاو کیا ہوا۔ صفائی ایسی کہ ایک تِنکا کہیں پڑا نظر نہ آیا، کوڑے کا تو کیا ذکر ہے۔ اور عمارتیں رنگ بہ رنگ کی۔ اور رات کو رستوں میں دو رستہ قدم بہ قدم روشنی۔ اور شہر کے باہر باغات کہ جن میں عجائب گل بوٹے اور میوے نظر آئے کہ شاید سوائے بہشت کے کہیں اور نہ ہوں گے۔ جو وہاں کی تعریف کروں سو بجا ہے۔

غرض سوداگروں کے آنے کا چرچا ہوا۔ ایک خواجہ سرا معتبر سوار ہو کر اور کئی خدمت گار ساتھ لے کر قافلے میں آیا اور بیوپاریوں سے پوچھا کہ تمھارا سردار کون سا ہے؟ سبھوں نے میری طرف اشارت کی۔ وہ محلی میرے مکان میں آیا۔ میں تعظیم بجالایا۔ باہم سلام علیک ہوئی۔ اُس کو سوزنی پر بٹھایا، تکیے کی تواضع کی۔ بعد اس کے میں نے پوچھا کہ صاحب کے تشریف لانے کا کیا باعث ہے؟ فرمایئے۔ جواب دیا کہ شہزادی نے سُنا ہے کہ سوداگر آئے ہیں اور بہت جنس لائے ہیں لہٰذا مجھ کو حکم کیا کہ جا کر اُن کو حضور میں لے آؤ۔ پس تم جو کچھ اسباب لائق بادشاہوں کی سرکار کے ہو، ساتھ لے کر چلو اور سعادت آستانہ بوسی کی حاصل کرو۔

میں نے جواب دیا کہ آج تو ماندگی کے باعث قاصر ہوں، کل جان و مال سے حاضر ہوں۔ جو کچھ اِس عاجز کے پاس موجود ہے، نذر گُزرانوں گا۔ جو پسند آوے، مال سرکار کا ہے۔ یہ وعدہ کر کر اور عطر پان دے کر خواجہ کو رُخصت کیا اور سب سوداگروں کو اپنے پاس بلا کر جو جو تُحفہ جس کے پاس تھا، لے لے کر جمع کیا اور جو میرے گھر میں تھا، وہ بھی لیا اور صبح کے وقت دروازے پر بادشاہی محل کے حاضر ہوا۔ باری داروں نے میری خبر عرض کی۔ حکم ہوا کہ حُضور میں لاؤ۔ وہی خواجہ سرا نکلا اور میرا ہاتھ ہاتھ میں لے کر دوستی کی راہ سے باتیں کرتا ہوا لے چلا۔ پہلے خواص پُرے سے ہو کر ایک مکانِ عالی شان میں لے گیا۔ اے عزیز! تو باور نہ کرے گا! یہ عالم نظر آیا گویا پَر کاٹ کر پریوں کو چھوڑ دیا ہے۔ جس طرف دیکھتا تھا نگاہ گڑ جاتی تھی۔ پانو زمین سے اُکھڑے جاتے تھے۔ بہ زور اپنے تئیں سنبھالتا ہوا روبرو پہنچا۔ جونہیں بادشاہ زادی پر نظر پڑی، غش کی نوبت ہوئی اور ہاتھ پانو میں رعشہ ہو گیا۔

بہر صورت سلام کیا۔ دونوں طرف دستِ راست اور دستِ چپ، صف بہ صف نازنینانِ پری چہرہ دست بستہ کھڑی تھیں۔ میں جو کچھ قسمِ جواہر اور پارچۂ پوشاکی اور تُحفہ اپنے ساتھ لے گیا تھا، جب کئی کشتیاں حضور میں چُنیں گئیں: از بس کہ سب جنس لائق پسند کے تھی، خوش ہو کر خانساماں کے حوالے ہوئی اور فرمایا کہ قیمت اس کی بہ موجبِ فَرد کے کل دی جائے گی۔ میں تسلیمات بجا لایا اور دل میں خوش ہوا کہ اِس بہانے سے بھلا کل بھی آنا ہو گا۔ جب رُخصت ہو کر باہر آیا تو سودائی کی طرح کہتا کچھ تھا اور مُنہ سے کچھ نکلتا تھا۔ اسی طرح سَرا میں آیا، لیکن حواس بجا نہ تھے۔ سب آشنا دوست پوچھنے لگے کہ تمھاری کیا حالت ہے؟ میں نے کہا: اتنی آمد و رفت سے گرمی دماغ میں چڑھ گئی ہے۔

غرض وہ رات تلملاتے کاٹی۔ فجر کو پھر جا کر حاضر ہوا اور اُسی خواجہ کے ساتھ پھر محل میں پہنچا۔ وہی عالم جو کل دیکھا تھا، دیکھا۔ بادشاہ زادی نے مجھے دیکھا اور ہر ایک کو اپنے اپنے کام پر رُخصت کیا۔ جب بَرچھا ہوا، خَلوت میں اُٹھ گئیں اور مجھے طلب کیا۔ جب میں وہاں گیا، بیٹھنے کا حکم کیا۔ میں آداب بجا لا کر بیٹھا۔ فرمایا کہ یہاں جو تو آیا اور یہ اسباب لایا، اِس میں مُنافع کتنا منظور ہے؟ میں نے عرض کی کہ آپ کے قدم دیکھنے کی بڑی خواہش تھی، سو خدا نے میسر کی۔ اب میں نے سب کچھ بھر پایا اور دونوں جہان کی سعادت حاصل ہوئی۔ اور قیمت جو کچھ فہرست میں ہے، نِصف کی خرید ہے اور نِصف نفع ہے۔ فرمایا: نہیں، جو قیمت تو نے لکھی ہے، وہ عنایت ہو گی بلکہ اور بھی انعام دیا جائے گا۔ بہ شرطیکہ ایک کام تجھ سے ہو سکے تو حکم کروں۔

میں نے کہا کہ غلام کا جان و مال اگر سرکار کے کام آوے تو میں اپنے طالعوں کی خوبی سمجھوں اور آنکھوں سے کروں۔ یہ سن کر قلم دان یاد فرمایا۔ ایک شُقّہ لکھا اور موتیوں کے ذُلسیان میں رکھ کر، ایک رومال شبنم کا اوپر لپیٹ کر میرے حوالے کیا اور ایک انگوٹھی نشان کے واسطے اُنگلی سے اُتار دی اور کہا کہ اس طرف کو ایک بڑا باغ ہے، دل کُشا اُس کا نام ہے، وہاں تو جا کر، ایک شخص کیخسر و نام داروغہ ہے، اُس کے ہاتھ میں یہ اُنگشتری دیجو اور ہماری طرف سے دُعا کہیو اور اس رُقعے کا جواب مانگیو۔ لیکن جلد آئیو۔ اگر کھانا وہاں کھائیو تو پانی یہاں پیجو۔ اِس کام کا انعام تجھے ایسا دوں گی کہ تو دیکھے گا۔ میں رُخصت ہوا اور پوچھتا پوچھتا چلا۔ قریب دو کوس کے جب گیا، وہ باغ نظر پڑا۔ جب پاس پہنچا، ایک عزیز مسلح مجھ کو پکڑ کے دروازے میں باغ کے لے گیا۔ دیکھوں تو ایک جوان شیر کی سی صورت، سونے کی کُرسی پر زرہ داؤدی پہنے، چار آئینہ باندھے، فولادی خود سر پر دھرے، نہایت شان و شوکت سے بیٹھا ہے اور پان سے جوان تیار، ڈھال تلوار ہاتھ میں لیے اور ترکش کمان باندھے، مُستعد پرا باندھے کھڑے ہیں۔

میں نے سلام کیا۔ مجھے نزدیک بُلایا۔ میں نے وہ خاتم دی اور خوشامد کی باتیں کر کر وہ رومال دکھایا اور شُقّے کے بھی لانے کا احوال کہا۔ اُس نے سُنتے ہی اُنگلی دانتوں سے کاٹی اور سر دُھن کر بولا کہ شاید تیری اجل تجھ کو لے آئی ہے۔ خیر باغ کے اندر جا۔ سَرو کے درخت میں ایک آہنی پنجرہ لٹکتا ہے۔ اُس میں ایک جوان قید ہے۔ اُس کو یہ خط دے کر، جواب لے کر جلدی پھر آ۔ میں شتاب باغ میں گھسا۔ باغ کیا تھا، گویا جیتے جی بہشت میں گیا۔ ایک ایک چمن رنگ بہ رنگ کا پھول رہا تھا اور فوارے چھوٹ رہے تھے، جانور چہچہے مار رہے تھے۔ میں سیدھا چلا گیا اور اُس درخت میں وہ قفس دیکھا۔ اُس میں ایک جوانِ حسین نظر آیا۔ میں نے ادب سے سر نہوڑایا اور سلام کیا اور وہ خریطہ سَر بہ مُہر پنجرے کی تیلیوں کی راہ سے دیا۔ وہ عزیز رُقعہ کھول کر پڑھنے لگا اور مجھ سے مُشتاق وار احوال ملکہ کا پوچھنے لگا۔

ابھی باتیں تمام نہ ہوئیں تھیں کہ ایک فوج زنگیوں کی نمود ہوئی اور چاروں طرف سے مجھ پر آ ٹوٹی اور بے تحاشی برچھی و تلوار مارنے لگی۔ ایک آدمی نہتّے کی بساط کیا، ایک دم میں چور زخمی کر دیا۔ مجھے کچھ اپنی سُدھ بُدھ نہ رہی۔ پھر جو ہوش آیا، اپنے تئیں چارپائی پر پایا کہ دو پیادے اٹھائے لیے جاتے ہیں اور آپس میں بتیاتے ہیں۔ ایک نے کہا: اِس مُردے کی لُوتھ کو میدان میں پھینک دو، کُتے کوّے کھا جائیں گے۔ دوسرا بولا: اگر بادشاہ تحقیق کرے اور یہ خبر پہنچے تو جیتا گڑوا دے اور بال بچوں کو کولھو میں پِڑوا دے۔ کیا ہمیں اپنی جان بھاری پڑی ہے جو ایسی نامعقول حرکت کریں۔

میں نے یہ گفتگو سُن کر دونوں یاجوج ماجوج سے کہا کہ واسطے خدا کے مجھ پر رحم کرو، ابھی مجھ میں ایک رَمَق جان باقی ہے۔ جب مر جاؤں گا، جو تمھارا جی چاہے گا سو کیجو۔ مُردہ بہ دست زندہ۔ لیکن یہ تو کہو کہ مجھ پر یہ کیا حقیقت بیتی، مجھے کیوں مارا، اور تم کون ہو؟ بھلا اتنا تو کہہ سُناؤ۔ تب اُنھوں نے رحم کھا کر کہا کہ وہ جوان جو قفس میں بند ہے، اس بادشاہ کا بھتیجا ہے اور پہلے اس کا باپ تخت نشیں تھا۔ رحلت کے وقت یہ وصیت اپنے بھائی کو کی کہ ابھی میرا بیٹا جو وارث اس سلطنت کا ہے، لڑکا اور بے شعور ہے؛ کار بار بادشاہت کا خیر خواہی اور ہوشیاری سے تم کیا کیجو۔ جب یہ بالغ ہو، اپنی بیٹی سے شادی اس کی کر دیجو اور مختار تمام مُلک اور خزانے کا کیجو۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے وفات پائی اور سلطنت کی نوبت چھوٹے بھائی پر آئی۔ اُس نے وصیت پر عمل نہ کیا بلکہ دیوانہ اور سودائی مشہور کر کے پنجرے میں ڈال دیا۔ اور چوکی گاڑھی چاروں طرف باغ کے رکھی ہے کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا اور کئی مرتبے زہر ہلاہل دیا ہے، لیکن زندگی زبردست ہے، اثر نہیں کیا۔ اب وہ شہزادی اور یہ شہزادہ دونوں عاشق معشوق بن رہے ہیں۔ وہ گھر میں تلپھے ہے اور یہ قفس میں تڑپھے ہے۔ تیرے ہاتھ شوق کا نامہ اُس نے بھیجا؛ یہ خبر ہرکاروں نے بہ جنس بادشاہ کو پہنچائی۔ حبشیوں کا دستہ متعین ہوا۔ تیرا یہ احوال کیا اور اُس جوان قیدی کے قتل کی وزیر سے تدبیر پوچھی۔ اُس نمک حرام نے ملکہ کو راضی کیا ہے کہ اُس بے گناہ کو بادشاہ کے حضور اپنے ہاتھ سے مار ڈالے۔

میں نے کہا: چلو مرتے مرتے یہ بھی تماشا دیکھ لیں۔ آخر راضی ہو کر وہ دونوں اور میں زخمی، چپکے ایک گوشے میں جا کر کھڑے ہوئے۔ دیکھا تو تخت پر بادشاہ بیٹھا ہے اور ملکہ کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہے اور شہزادے کو پنجرے سے باہر نکال کر روبرو کھڑا کیا۔ ملکہ جلاد بن کر، شمشیرِ برہنہ لیے ہوئے، اپنے عاشق کے قتل کرنے کو آئی۔ جب نزدیک پہنچی، تلوار پھینک دی اور گلے میں چمٹ گئی۔ تب وہ عاشق بولا کہ ایسے مرنے پر میں راضی ہوں۔ یہاں بھی تیری آرزو ہے، وہاں بھی تیری تمنا رہے گی۔ ملکہ بولی کہ اس بہانے سے میں تیرے دیکھنے کو آئی تھی۔ بادشاہ یہ حرکت دیکھ کر سخت برہم ہوا اور وزیر کو ڈانٹا کہ تو یہ تماشا مجھے دکھلانے کو لایا تھا؟ محلی ملکہ کو جُدا کر کے محل میں لے گئے اور وزیر نے خفا ہو کر تلوار اُٹھائی اور بادشاہ زادے کے اُوپر دوڑا کہ ایک ہی وار میں کام اُس بچارے کا تمام کرے۔ جوں چاہتا ہے کہ تیغا چلاوے، غیب سے ایک تیر نا گہانی اُس کی پیشانی پر بیٹھا کہ دوسار ہو گیا اور وہ گر پڑا۔

بادشاہ یہ واردات دیکھ کر محل میں گھس گئے۔ جوان کو پھر قفس میں بند کر کر باغ میں لے گئے۔ میں بھی وہاں سے نکلا۔ راہ میں سے ایک آدمی مجھے بلا کر ملکہ کے حضور میں لے گیا۔ مجھے گھائل دیکھ کر، ایک جراح کو بُلوایا اور نہایت تقید سے فرمایا کہ اِس جوان کو جلد چنگا کر کے غسلِ شفا کا دے، یہی تیرا مجرا ہے۔ اِس کے اوپر جتنی محنت تو کرے گا، ویسا ہی انعام اور سرفرازی پاوے گا۔ غرض وہ جراح بہ موجب ارشادِ ملکہ کے، تگ و دو کر کے ایک چلّے میں نہلا دھلا، مجھے حضور میں لے گیا۔ ملکہ نے پوچھا کہ اب تو کچھ کسر باقی نہیں رہی؟ میں نے

کہا کہ آپ کی توجّہ سے اب بھلا چنگا ہوں۔ تب ملکہ نے ایک خِلعت اور بہت سے روپے جو فرمائے تھے، بلکہ اُس سے بھی دو چند عطا کیے اور رُخصت کیا۔

میں نے وہاں سے سب رفیق اور نوکر چاکروں کو لے کر کوچ کیا۔ جب اِس مقام پر پہنچا۔ سب کو کہا: تم اپنے وطن کو جاؤ اور میں نے اِس پہاڑ پر یہ مکان اور اُس کی صورت بنا کر، اپنا رہنا مقرر کیا اور نوکروں اور غلاموں کو موافق ہر ایک کی قدر کے روپے دے کر آزاد کیا۔ اور یہ کہہ دیا کہ جب تلک میں جیتا رہوں، میرے قوت کی خبر گیری تمھیں ضرور ہے، آگے مختار ہو۔ اب وہی اپنی نمک حلالی سے میرے کھانے کی خبر لیتے ہیں اور میں بہ خاطر جمع اِس بُت کی پرستش کرتا ہوں۔ جب تلک جیتا ہوں، میرا یہی کام ہے۔ یہ میری سرگذشت ہے جو تو نے سُنی۔

یا فقرا! میں نے بہ مجرد سُننے اِس قصّے کے، کفنی گلے میں ڈالی اور فقیروں کا لباس کیا اور اشتیاق میں فرنگ کے مُلک کے دیکھنے کے، روانہ ہوا۔ کتنے ایک عرصے میں جنگل پہاڑوں کی سیر کرتا ہوا مجنوں اور فرہاد کی صورت بن گیا۔

آخر میرے شوق نے اُس شہر تلک پہنچایا۔ گلی کوچے میں باولا سا پھرنے لگا۔ اکثر ملکہ کے محل کے آس پاس رہا کرتا، لیکن کوئی ڈھب ایسا نہ ہوتا جو وہاں تلک رسائی ہو۔ عجب حیرانی تھی کہ جس واسطے یہ محنت کشی کر کر گیا، وہ مطلب ہاتھ نہ آیا۔ ایک دن بازار میں کھڑا تھا کہ ایک بارگی آدمی بھاگنے لگے اور دُکان دار دُکانیں بند کر کے چلے گئے۔ یا وہ رونق تھی یا سُنسان ہو گیا۔ ایک طرف سے ایک جوان رستم کا سا کلّہ ببر شیر کی مانند گونجتا اور تلوار دو دستی جھاڑتا ہوا، زِرہ بکتر گلے میں اور ٹوپ جھلم کا سر پر اور طمنچے کی جوڑی کمر میں، کیفی کی طرح بکتا جھکتا نظر آیا اور اُس کے پیچھے دو غلام بنات کی پوشاک پہنے، ایک تابوت مخمل کا شانی سے مڑھا ہوا سر پر لیے چلے آتے ہیں۔

میں نے یہ تماشا دیکھ کر ساتھ چلنے کا قصد کیا۔ جو کوئی آدمی میری نظر پڑتا، مجھے منع کرتا۔ لیکن میں کب سُنتا ہوں۔ رفتہ رفتہ وہ جواں مرد ایک عالی شان مکان میں چلا، میں بھی ساتھ ہوا۔ اُس نے پھرتے ہی چاہا کہ ایک ہاتھ مارے اور مجھے دو ٹکڑے کرے؛ میں نے اُسے قسم دی کہ میں بھی یہی چاہتا ہوں، میں نے اپنا خون مُعاف کیا؛ کسو طرح مجھے اِس زندگی کے عذاب سے چھڑوا دے کہ نہایت بہ تنگ آیا ہوں۔ میں جان بوجھ کر تیرے سامنے آیا ہوں، دیر مت کر۔ مجھے مرنے پر ثابت قدم دیکھ کر خدا نے اُس کے دل میں رحم ڈالا اور غصہ بھی ٹھنڈا ہوا؛ اور بہت توجّہ اور مہربانی سے پوچھا کہ تو کون ہے اور کیوں اپنی زندگی سے بیزار ہوا ہے؟

میں نے کہا: ذرا بیٹھیے تو کہوں، میرا قصہ بہت دور دراز ہے۔ اور عشق کے پنجے میں گرفتار ہوں، اس سبب لاچار ہوں۔ یہ سُن کر اُس نے اپنی کمر کھولی اور ہاتھ مُنہ دھو کر کچھ ناشتا کیا۔ مجھے بھی باعث ہوا۔ جب فراغت کر کے بیٹھا، بولا: کہہ تجھ پر کیا گزری؟ میں نے سب واردات اُس پیر مرد کی اور ملکہ کی اور اپنے وہاں جانے کی کہہ سُنائی۔ پہلے سُن کر رویا اور یہ کہا کہ اِس کم بخت نے کس کس کا گھر گھالا۔ لیکن بھلا تیرا علاج میرے ہاتھ میں ہے۔ اَغلب ہے کہ اِس عاصی کے سبب سے تو اپنی مُراد کو پہنچے۔ اور تو اندیشہ نہ کر خاطر جمع رکھ۔ حجام کو فرمایا کہ اِس کی حجامت کر کے حمام کروا دے۔ ایک جوڑا کپڑا اُس کے غلام نے لا کر پہنایا۔ تب مجھ سے کہنے لگا کہ یہ تابوت جو تو نے دیکھا، اُسی شہزادۂ مرحوم کا ہے جو قفس میں مقیّد تھا۔ اُس کو دوسرے وزیر نے آخر مکر سے مارا۔ اُس کی تو نجات ہوئی کہ مظلوم مارا گیا۔ میں اُس کا کوکا ہوں۔ میں نے بھی اُس وزیر کو بہ ضربِ شمشیر مارا اور بادشاہ کے مارنے کا ارادہ کیا۔ بادشاہ گڑگڑایا اور سوگند کھانے لگا کہ میں بے گناہ ہوں میں نے اُسے نامرد جان کر چھوڑ دیا۔ جب سے میرا کام یہی ہے کہ ہر مہینے کی نَوچندی جُمعرات (4) کو، میں اِس تابوت کو اِسی طرح شہر میں لیے پھرتا ہوں اور اُس کا ماتم کرتا ہوں۔

اُس کی زبانی یہ احوال سُننے سے مجھے تسلّی ہوئی کہ اگر یہ چاہے تو میرا مقصد بر آوے گا۔ خدا نے بڑا احسان کیا جو ایسے جنونی کو مجھ پر مہربان کیا۔ سچ ہے خدا مہربان ہو تو کل مہربان۔ جب شام ہوئی اور آفتاب غروب ہوا، اُس جوان نے تابوت کو نکالا اور ایک غلام کے عِوض وہ تابوت میرے سر پر دھرا اور اپنے ساتھ لے کر چلا۔ فرمانے لگا کہ ملکہ کے نزدیک جاتا ہوں، تیری سفارش تا بہ مقدور کروں گا۔ تو ہرگز دم نہ ماریو، چپکا بیٹھا سُنا کیجو۔ میں نے کہا: جو کچھ صاحب فرماتے ہیں، سو ہی کروں گا، خدا تم کو سلامت رکھے جو میرے احوال پر ترس کھاتے ہو۔ اُس جوان نے قصد بادشاہی باغ کا کیا۔ جب اندر داخل ہوا، ایک چبوترہ سنگ مرمر کا ہشت پہلو باغ کے صحن میں تھا اور اُس پر ایک نمگیرہ سفید بادلے کا، موتیوں کی جھالر لگی ہوئی الماس کے استادوں پر کھڑا تھا اور ایک مسندِ مُغرّق بچھی تھی، گاؤ تکیہ اور بغلی تکیے زربفت کے لگے ہوئے۔ وہ تابوت وہاں رکھوایا اور ہم دونوں کو فرمایا کہ اُس درخت کے پاس جا کر بیٹھو۔

بعد ایک ساعت کے مشعل کی روشنی نظر آئی۔ ملکہ آپ، کئی خواصیں پس و پیش اِہتمام کرتی ہوئیں، تشریف لائیں لیکن اُداسی اور خفگی چہرے پر ظاہر تھی۔ آ کے مسند پر بیٹھیں۔ یہ کوکا ادب سے دست بستہ کھڑا رہا۔ پھر ادب سے دور فرش کے کنارے مؤدّب بیٹھا۔ فاتحہ پڑھیں اور کچھ باتیں کرنے لگا۔ میں کان لگائے سُن رہا تھا۔ آخر اُس جوان نے کہا کہ مَلِکۂ جہاں سلامت! مُلکِ عجم کا شہزادہ آپ کی خوبیاں اور محبوبیاں غائبانہ سُن کر اپنی سلطنت کو برباد دے، فقیر بن، مانند اِبراہیم ادہم کے تباہ ہو اور بڑی محنت کھینچ کر یہاں تلک آ پہنچا ہے۔ سائیں تیرے کارنے چھوڑا شہرِ بلخ۔ اور اِس شہر میں بہت دنوں سے حیران پریشان پھرتا ہے۔ آخر وہ قصد مرنے کا کر کے میرے ساتھ لگ چلا۔ میں نے تلوار سے ڈرایا، اُس نے گردن آگے دھر دی اور قسم دی کہ اب میں یہی چاہتا ہوں، دیر مت کر۔ غرض تمھارے عشق میں ثابت ہے۔ میں نے خوب آزمایا، سب طرح پورا پایا؛ اِس سبب سے اُس کا مذکور میں درمیان لایا۔ اگر حضور سے

اُس کے اَحوال پر مُسافر جان کر توجُّہ ہو تو خدا ترسی اور حق شناسی سے دور نہیں۔

یہ ذکر مَلِکہ نے سُن کر فرمایا: کہاں ہے؟ اگر شہزادہ ہے تو کیا مُضا ئقہ! روبرو آوے۔ وہ کوکا وہاں سے اُٹھ کر آیا اور مجھے ساتھ لے کر گیا۔ میں ملکہ کے دیکھنے سے نہایت شاد ہوا لیکن عقل و ہوش برباد ہوئے، عالمِ سکوت کا ہو گیا۔ یہ ہوا و نہ پڑا کہ کچھ کہوں۔ ایک دم میں ملکہ سِدھاری اور کوکا اپنے مکان کو چلا۔ گھر آ کر بولا کہ میں نے تیری سب حقیقت اوّل سے آخر تک ملکہ کو کہہ سُنائی اور سفارش بھی کی، اب تو ہمیشہ رات کو بلا ناغہ جایا کر اور عیش خوشی منایا کر۔ میں اُس کے قدم پر گر پڑا۔ اُس نے گلے لگا لیا۔ تمام دن گھڑیاں گنتا رہا کہ کب سانجھ ہو، جو میں جاؤں۔ جب رات ہوئی، میں اُس جوان سے رُخصت ہو کر چلا اور پائیں باغ میں ملکہ کے چبوترے پر تکیہ لگا کر جا بیٹھا۔

بعد ایک گھڑی کے ملکہ تنِ تنہا ایک خواص کو ساتھ لے کر آہستہ آہستہ آ کر مَسند پر بیٹھیں۔ خوش طالعی سے یہ دن میسر ہوا۔ میں نے قدم بوس کیا۔ اُنھوں نے سر میرا اُٹھا لیا اور گلے سے لگا لیا اور بولیں کہ اِس فرصت کو غنیمت جان اور میرا کہا مان: مجھے یہاں سے لے نکل، کسو اور مُلک چل۔ میں نے کہا: چلیے۔ یہ کہہ کر ہم دونوں باغ کے باہر تو ہوئے، پر حیرت سے اور خوشی سے ہاتھ پانو پھول گئے اور راہ بھول گئے اور ایک طرف کو چلے جاتے تھے۔ پر کچھ ٹھکانا نہیں پاتے تھے۔ ملکہ برہم ہو کر بولی کہ اب میں تھک گئی، تیرا مکان کہاں ہے؟ جلد چل کر پہنچ، نہیں تو کیا کیا چاہتا ہے؟ میرے پانو میں پھپھولے پڑ گئے ہیں، رستے میں کہیں بیٹھ جاؤں گی۔

میں نے کہا کہ میرے غلام کی حویلی نزدیک ہے، اب آ پہنچے، خاطر جمع رکھو اور قدم اُٹھاؤ۔ جھوٹھ تو بولا، پر دل میں حیران تھا کہ کہاں لے جاؤں! عین راہ پر ایک دروازہ مُقفّل نظر پڑا۔ جلدی سے قُفل کو توڑ کر مکان کے بھیتر گئے۔ اچھی حویلی، فرش بچھا ہوا، شراب کے شیشے بھرے قرینے سے طاق میں دھرے اور باورچی خانے میں نان کباب تیار تھے۔ ماندگی کمال ہو رہی تھی، ایک ایک گلابی شرابِ پُرتگالی کی اُس گزک کے ساتھ لی اور ساری رات باہم خوشی کی۔ جب اِس ضِمن سے صبح ہوئی، شہر میں غُل مچا کہ شہزادی غائب ہوئی۔ محلّہ محلّہ، کوچہ کوچہ مُنادی پھرنے لگی اور کُٹنیاں اور ہرکارے چھوٹے کہ جہاں سے ہاتھ آوے، پیدا کریں اور سب دروازوں پر شہر کے بادشاہی غلاموں کی چوکی آ بیٹھی۔ گذربانوں کو حکم ہوا کہ بغیر پروانگی، چیونٹی باہر شہر کے نہ نکل سکے۔ جو کوئی سُراغ ملکہ کا لا دے گا، ہزار اشرفی اور خِلعت انعام پاوے گا۔ تمام شہر میں کُٹنیاں پھرنے اور گھر گھر میں گھسنے لگیں۔

مجھے جو کم بختی لگی، دروازہ بند نہ کیا۔ ایک بُڑھیا شیطان کی خالا، اُس کا خدا کرے منہ کالا، ہاتھ میں تسبیح لٹکائے، بُرقع اوڑھے، دروازہ کھلا پا کر بدھڑک چلی آئی اور سامنے ملکہ کے کھڑی ہو کر، ہاتھ اُٹھا کر دُعا دینے لگی کہ الٰہی! تیری نتھ چوڑی سُہاگ کی سلامت رہے اور کماؤ کی پگڑی قائم رہے! میں غریب رنڈیا، فقیرنی ہوں۔ ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دو جی سے پورے دنوں دردِ زہ میں مرتی ہے اور مجھ کو اتنی وسعت نہیں کہ اَدھی کا تیل چراغ میں جلاؤں۔ کھانے پینے کو تو کہاں سے لاؤں! اگر مر گئی تو گور کفن کیوں کر کروں گی؟ اور جَنی تو دائی جنائی کو کیا دوں گی؟ اور جَچا کو ستھوارا، اچھوانی کہاں سے پلاؤں گی؟ آج دو دن ہوئے ہیں کہ بھوکی پیاسی پڑی ہے۔ اے صاحب زادی! اپنی خیر کچھ ٹکڑا پارچہ دلا تو اُس کو پانی پینے کا اَدھار ہو۔

ملکہ نے تَرس کھا کر، اپنے نزدیک بُلا کر چار نان اور کباب اور ایک انگوٹھی چھنگلیا سے اُتار کر حوالے کی کہ اِس کو بیچ باچ کر گہنا پاتا بنا دیجو اور خاطر جمع سے گزران کیجو اور کبھو آیا کیجو۔ تیرا گھر ہے۔ اُس نے اپنے دل کا مُدّعا، جس کی تلاش میں آئی تھی، بہ جنس پایا۔ خوشی سے دعائیں دیتی اور بَلائیں لیتی دَفع ہوئی۔ ڈیوڑھی میں نان کباب پھینک دیے مگر انگوٹھی کو مٹھی میں لے لیا کہ پتا ملکہ کے ہاتھ کا میرے ہاتھ آیا۔ خدا اُس آفت سے جو بچایا چاہے، اُس مکان کا مالک جواں مرد سپاہی، تازی گھوڑے پر چڑھا ہوا، نیزہ ہاتھ میں لیے شکار بند سے ایک ہرن لٹکائے آ پہنچا۔ اپنی حویلی کا تالا ٹوٹا اور کواڑ کھلے پائے، اُس دَلّالہ کو نکلتے دیکھا؛ مارے غُصّے کے ایک ہاتھ سے اُس کے جھونٹے پکڑ کر لٹکا لیا اور گھر میں آیا۔ اُس کے دونوں پانو میں رَسی باندھ کر ایک درخت کی ٹہنی میں لٹکایا۔ سر تلے، پانو اوپر کیے۔ ایک دم میں تڑپھ تڑپھ کر مر گئی۔ اُس مرد کی صورت دیکھ کر یہ ہیبت غالب ہوئی کہ ہوائیاں منہ پر اُڑنے لگیں اور مارے ڈر کے کلیجا کانپنے لگا۔ اُس عزیز نے ہم دونوں کو بدحواس دیکھ کر تسلّی دی کہ بڑی نادانی تم نے کی۔ ایسا کام کیا اور دروازہ کھول دیا!

ملکہ نے مُسکرا کر فرمایا کہ شہزادہ اپنے غلام کی حویلی کہہ کر مجھے لے آیا اور مجھ کو پھسلایا۔ اُس نے التماس کیا کہ شہزادے نے بیانِ واقعی کیا۔ جتنی خَلق اللہ ہے، بادشاہوں کی لونڈی غلام ہیں۔ اُنھیں کی برکت اور فیض سے سب کی پَرورش اور نِرباہ ہے۔ یہ غُلام، بے دام دِرَم زرخرید تمھارا ہے لیکن بھید چھپانا عقل کا مُقتضا ہے۔ اے شاہ زادے! تمھارا اور ملکہ کا اِس غریب خانے میں توجُّہ فرمانا اور تشریف لانا میری سعادت دونوں جہان کی ہے، اور اپنے فِدوی کو سرفراز کیا۔ میں نِثار ہونے کو تیار ہوں، کسو صورت میں جان مال سے دریغ نہ کروں گا۔ آپ شوق سے آرام فرمائیے، اب کوڑی بھر خطرہ نہیں۔ یہ مُردار کُٹنی اگر سلامت جاتی تو آفت لاتی۔ اب جب تلک مزاج شریف چاہے، بیٹھے رہیے اور کچھ درکار ہو، اس خانہ زاد کو کہیے، سب حاضر کرے گا۔ اور بادشاہ تو کیا چیز ہے! تمھاری خبر فرشتے کو بھی نہ ہوگی۔ اُس جواں مرد نے ایسی ایسی باتیں تسلّی کی کہیں کہ تک خاطر جمع ہوئی۔ تب میں نے کہا: شاباش! تم بڑے مرد ہو! اِس مُرُوّت کا عوض ہم سے بھی جب ہو سکے گا تب ظُہور میں آوے گا۔ تمھارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: غُلام کا اِسم بہزاد خاں ہے۔ غرض چھ مہینے تک جتنی شرط خدمت کی تھی بہ جان و دل بجا لایا، خوب آرام سے گُزری۔

ایک دن مجھے اپنا ملک اور ماباپ یاد آئے اس لیے نہایت مُتفکّر بیٹھا تھا۔ میرا چہرہ مَلُول دیکھ کر بہزاد خاں روبرو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اس فدوی سے اگر کچھ تقصیر چاکر داری میں واقع ہوئی ہو تو اِرشاد ہو۔ میں نے کہا: از برائے خدا یہ کیا مذکور ہے! تم نے ایسا سُلوک کیا کہ اِس شہر میں ایسے آرام سے رہے جیسے اپنی ماں کے پیٹ میں کوئی رہتا ہے۔ نہیں تو یہ ایسی حرکت ہم سے ہوئی تھی کہ تنکا تنکا ہمارا دُشمن تھا۔ ایسا دوست ہمارا کون تھا کہ ذرا دم لیتے۔ خدا تمھیں خوش رکھے، بڑے مرد ہو۔ تب اُس نے کہا: اگر یہاں سے دل برداشتہ ہوا ہو تو جہاں حکم ہو، وہاں خیر وعافیت سے پہنچا دوں۔ فقیر بولا کہ اگر اپنے وطن تک پہنچوں تو والدین کو دیکھوں۔ میری تو یہ صورت ہوئی، خُدا جانے اُن کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ میں جس واسطے جَلا وطن ہوا تھا، میری تو آرزو برآئی؛ اب اُن کی بھی قدم بوسی واجب ہے۔ میری خبر اُن کو کچھ نہیں کہ مُوا یا جیتا ہے، اُن کے دل پر کیا قلق گُزرتا ہوگا! وہ جواں مرد بولا کہ بہت مُبارک ہے، چلیے۔ یہ کہہ کر ایک راس گھوڑا اتری سَو کوس چلنے والا اور ایک گھوڑی جلد، جس کے پَر نہیں کٹے تھے لیکن شایستہ، ملکہ کی خاطر لایا اور ہم دونوں کو سوار کروایا۔ پھر زِرہ بکتر پہن، سلاح باندھ، اُوچی بن، اپنے مرکب پر چڑھ بیٹھا اور کہنے لگا: غلام آگے ہو لیتا ہے، صاحِب خاطر جمع سے گھوڑے دبائے ہوئے چلے آویں۔

جب شہر کے دروازے پر آیا، ایک نعرہ مارا اور تبر سے قُفل کو توڑا اور نگہبانوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر للکارا کہ بدچودو! اپنے خاوند کو جا کر کہو کہ بہزاد خاں ملکۂ مہر نگار اور شہزادۂ کام گار کو، جو تمھارا داماد ہے، ہانکے پُکارے لیے جاتا ہے، اگر مَردُمی کا کچھ نشہ ہے تو باہر نکلو اور ملکہ کو چھین لو؛ یہ نہ کہو کہ چُپ چاپ لے گیا، نہیں تو قلعے میں بیٹھے آرام کیا کرو۔ یہ خبر بادشاہ کو جلد جا پہنچی۔ وزیر اور میر بخشی کو حکم ہوا: اُن تینوں بدذات مُفسِدوں کو باندھ کر لاؤ یا اُن کے سر کاٹ کر حُضور میں پہنچاؤ۔ ایک دَم کے بعد غٹ فوج کا نمود ہوا اور تمام زمین و آسمان گرد باد ہوگیا۔ بہزاد خاں نے ملکہ کو اور اس فقیر کو ایک در میں پُل کے، کہ بارہ پلے اور جون پور کے پُل کے برابر تھا، کھڑا کیا اور آپ گھوڑے کو متکیا کر اُس فوج کی طرف پھرا اور شیر کی مانند گونج کر مَرکب کو ڈپٹ کر فوج کے درمیان گھسا۔ تمام لشکر کائی سا پھٹ گیا اور یہ دونوں سرداروں تلک جا پہنچا۔ دونوں کے سر کاٹ لیے۔ جب سردار مارے گئے، لشکر تِتر بِتر ہوگیا۔ وہ کہاوت ہے: سِر سے سر واہ۔ جب بیل پھوٹی، رائی رائی ہوگئی۔ وونہیں آپ بادشاہ کتنی فوج بکتر پوشوں کی ساتھ لے کر کُمک کو آئے۔ اُن کی بھی لڑائی اُس یکّے جوان نے مار دی شکست فاش کھائی۔ بادشاہ پسپا ہوئے۔ سچ ہے فتح دادِ الٰہی ہے۔ لیکن بہزاد خاں نے ایسی جواں مردی کی کہ شاید رُستم سے بھی نہ ہوسکتی۔

جب بہزاد خاں نے دیکھا کہ مَطلع صاف ہوا، اب کون باقی رہا ہے جو ہمارا پیچھا کرے گا؛ بے وَسواس ہوکر اور خاطر جمع کر، جہاں ہم کھڑے تھے آیا اور ملکہ کو اور مجھ کو ساتھ لے کر چلا۔ سفر کی عُمر کوتاہ ہوتی ہے۔ تھوڑے عرصے میں اپنے ملک کی سرحد میں جا پہنچے۔ ایک عرضی صحیح سلامت آنے کی بادشاہ کے حُضور میں، جو قِبلہ گاہ مجھ فقیر کے تھے، لکھ کر روانہ کی۔ جہاں پناہ پڑھ کر شاد ہوئے، دوگانہ شکر کا ادا کیا، جیسے سوکھے دھان میں پانی پڑا۔ خوش ہوکر سب امیروں کو جلو میں لے کر اِس عاجز کے اِستقبال کی خاطر لبِ دریا آکر کھڑے ہوئے اور نواڑوں کے واسطے میرِ بحر کو حکم ہوا۔ میں نے دوسرے کنارے پر سواری بادشاہ کی کھڑی دیکھی، قدم بوسی کی آرزو میں گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا۔ ہیلہ مار کر حضور میں حاضر ہوا۔ مجھے مارے اِشتیاق کے کلیجے سے لگا لیا۔

اب ایک اور آفتِ ناگہانی پیش آئی کہ جس گھوڑے پر میں سوار تھا، شاید وہ بچہ اُسی مادیان کا تھا جس پر ملکہ سوار تھی۔ یا جنسیت کے باعث: میرے مَرکب کو دیکھ کر گھوڑی نے بھی جلدی کر کر اپنے تئیں ملکہ سمیت میرے پیچھے دریا میں گرایا اور پَیرنے لگی۔ ملکہ نے گھبرا کے باگ کھینچی۔ وہ مُنہ کی نرم تھی، اُلٹ گئی۔ ملکہ غوطے کھا کر بہ مع گھوڑی دریا میں ڈوب گئی کہ پھر اُن دونوں کا نشان نظر نہ آیا۔ بہزاد خاں نے یہ حالت دیکھ کر اپنے تئیں گھوڑے سمیت ملکہ کی مدد کی خاطر دریا میں پہنچایا۔ وہ بھی اُس بھنور میں آگیا، پھر نکل نہ سکا۔ بہتیرے ہاتھ پانو مارے، کچھ بس نہ چلا، ڈوب گیا۔ جہاں پناہ نے یہ واردات دیکھ کر مَہا جال منگوا کر پھنکوایا اور ملّاحوں اور غوطہ خوروں کو فرمایا۔ اُنھوں نے سارا دریا چھان مارا، تھاہ کی مٹی لے لے آئے، پر وے دونوں ہاتھ نہ آئے۔ یا فقرا! یہ حادِثہ ایسا ہوا کہ میں سودائی اور جنونی ہوگیا اور فقیر بن کر یہی کہتا پھرتا تھا: اِن نینوں کا یہی بسیکھ، وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ۔ اگر ملکہ کہیں غائب ہو جاتی یا مَر جاتی تو دل کو تسلی آتی پھر تلاش کو نکلتا یا صبر کرتا۔ لیکن جب نظروں کے روبرو غرق ہوگئی تو کچھ بس نہ چلا۔ آخر جی میں یہی لہر آئی کہ دریا میں ڈوب جاؤں شاید اپنے محبوب کو مر کر پاؤں۔

ایک روز رات کو اُسی دریا میں پَیٹھا اور ڈوبنے کا ارادہ کر کر گلے تک پانی میں گیا۔ چاہتا ہوں کہ آگے پانو رکھوں اور غوطہ کھاؤں، وہی سوار بُرقع پوش جنھوں نے تم کو بشارت دی ہے، آپہنچے۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دِلاسا دیا کہ خاطر جمع رکھ، ملکہ اور بہزاد خاں جیتے ہیں، تو اپنی جان ناحق کیوں کھوتا ہے! دُنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ خدا کی درگاہ سے مایوس مت ہو، اگر جیتا رہے گا تو تیری مُلاقات اُن دونوں سے ایک نہ ایک روز ہو رہے گی۔ اب تو روم کی طرف جا اور بھی دو درویشِ دل ریش وہاں گئے ہیں۔ اُن سے تو جب ملے گا، اپنی مُراد کو پہنچے گا۔

یا فُقرا! بہ موجب حکم اپنے ہادی کے، میں بھی خدمتِ شریف میں آکر حاضر ہوا ہوں۔ اُمّید قوی ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے مطلب کو پہنچے۔ اِس گلو گدا کا یہ اَحوال تھا، جو تمام کمال کہہ سُنایا۔

□□□

شمیم احمد صدیقی

سوائن فلو

سوائن فلو انگریزی زبان کے دو الفاظ کا مرکب ہے۔ اردو میں سوائن کو سور یا خنزیر اور فلو کو انفلوئنزا یا تپ نزلی کہتے ہیں۔ اس مرض میں شدید بخار، سستی، بھوک کی کمی، زکام اور کھانسی کے علاوہ اکثر بار بار چھینک کا آنا، گلے میں خراش اور الٹی یا بدہضمی کی علامات بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ انفلوئنزا کی ایک خاص قسم ہے جو ایک مخصوص وائرس (Virus) کے ذریعے خنزیر سے انسان میں اور پھر ایک انسان سے دوسرے انسان میں پھیلتا ہے۔ اگر بروقت علاج نہ ہو تو یہ مرض شدید قسم کے نمونیا میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے جسم کی قوتِ مدافعت مفلوج ہو جاتی ہے اور مریض موت کے منہ میں پہنچ جاتا ہے۔

وائرس اس قدر چھوٹے جرثومے ہوتے ہیں کہ وہ بیکٹیریا وغیرہ کا مشاہدہ کرنے والی عام خوردبین سے دکھائی نہیں دیتے بلکہ ایک لاکھ گنا زیادہ طاقتور الکٹرانک خوردبین کے ذریعے ہی ان کا مشاہدہ ممکن ہے۔ طب کی اصطلاح میں سوائن فلو کے وائرس کو انفلوئنزا۔اے (Infuenza-A) وائرس یا ایچ ون، این ون (H-1,N-1) وائرس کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ برخلاف ایڈز پھیلانے والے ایچ آئی وی (HIV) وائرس کے جو خون، مادۂ منویہ یا دودھ جیسے سیالات کے ذریعے ہی ایک انسانی جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتا ہے۔ سوائن فلو کا وائرس محض سانس چھوڑنے یا چھینک آنے پر ایک انسان سے دوسرے میں پہنچ کر نشو و نما پانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

سوائن فلو کی دریافت سب سے پہلے 1918 میں اسپین میں ہوئی تھی۔ اس وقت اس نے ایسی وبائی شکل اختیار کی تھی کہ صرف امریکا میں پچاس ہزار سے زائد اور تمام عالم میں لگ بھگ دو لاکھ افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ اسپین میں اس کی موجودگی 1957 تک دیکھی گئی۔ اسی لیے اولاً اس کا نام اسپینش فلو (Spanish Flu) رکھا گیا تھا۔ 1930 میں پہلی بار یہ دریافت ہوئی کہ اس وائرس کی نشو و نما کے لیے خنزیر کا جسم اور گوشت نہایت سازگار جگہ ہے۔ اسی وجہ سے نام تبدیل کر کے سوائن فلو کر دیا گیا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا سوائن فلو کا وائرس خنزیر سے انسان میں اور پھر انسان سے انسان میں سانس کے راستے بہ آسانی پہنچ جاتا ہے۔

اس سال یعنی 2009 میں سوائن فلو ایک مرتبہ پھر قہر الٰہی کی طرح نمودار ہوا ہے۔ اس کی ابتدا مارچ کے اواخر میں سور کا گوشت بکثرت استعمال کرنے والے ملک میکسکو سے ہوئی۔ انسانوں کی آمد و رفت کی برق رفتاری کی بنا پر یہ فلو میکسکو، اسپین، برطانیہ، جرمنی، امریکا وغیرہ کا سفر کرتا ہوا دنیا کے مختلف ممالک میں پھیل گیا۔ میکسکو میں اس سے متاثر ہو کر مرنے والوں کی تعداد دو سو سے زائد ہو چکی ہے جبکہ دوسرے ممالک میں ہلاکتیں کم ہوئی ہیں۔ مرض پھیلنے کی اہم وجہ یہ رہی کہ وائرس کی شناخت اور اس کے علاج میں قدرے تاخیر ہوئی۔ شناخت ہو جانے کے بعد احتیاطی تدابیر اختیار کی گئیں۔ مجموعی ہلاکتوں کی بنا پر نہیں بلکہ جغرافیائی اعتبار سے دنیا کے بڑے حصے میں پھیلاؤ کی بنا پر عالمی ادارۂ صحت (WHO) نے اس فلو کو عالمی وبا قرار دے دیا ہے۔ گذشتہ چالیس سال کے عرصے میں کسی دوسری بیماری کو اس زمرے میں نہیں رکھا گیا۔ عالمی ادارۂ صحت نے دنیا بھر کی حکومتوں کو خبردار کیا ہے کہ وہ اپنے عوام کو اس وبا سے بچانے کے لیے تمام احتیاطی اقدام کریں ورنہ یہ لاکھوں افراد کی ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔

سوائن فلو کے پھیلاؤ کو کنٹرول کرنے کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ ان ممالک سے آنے والے افراد کا جہاں یہ وبا پھیلی ہو، اچھی طرح چیک اپ کیا جائے۔ اگر بیماری کا شبہ ہو تو بلا تاخیر اور دباؤ ڈال کر مشتبہ شخص کو اسپتال میں داخل کیا جائے۔ ہوائی سفر کرنے والوں اور ہوائی اڈوں وغیرہ پر چیک اپ کرنے والوں نیز ان اسپتالوں کے عملے کو جہاں سوائن فلو کے مریض زیرِ علاج ہوں اپنے منہ اور ناک پر ماسک چڑھائے رکھنا چاہیے۔ جن مقامات پر یہ وبا پھیل چکی ہے وہاں کی حکومتوں کو اپنے باشندوں کے باہری ملکوں کے سفر پر پابندی عائد کرنا چاہیے یا کم از کم اچھی طرح چیکنگ کرنے اور وائرس سے متاثر نہ ہونے کا اطمینان کرنے کے بعد ہی ان کو سفر کی اجازت دینی چاہیے۔ جن علاقوں میں یہ وبا موجود ہو وہاں جانے سے گریز کیا جائے۔ ہوائی اڈوں پر چیکنگ کرنے والے عملے کو اور اسپتال میں سوائن فلو کے مریضوں کی دیکھ بھال کرنے والوں کو ماسک کے استعمال کے علاوہ ہر متاثر شخص سے ملنے کے بعد ہاتھوں کو صابن سے اچھی طرح دھونا چاہیے۔ متاثر افراد کو بھی تھوکتے اور چھینکتے وقت احتیاط کرنا چاہیے اور تھوک یا چھینک کو ٹشو پیپر میں لے کر بعد میں اس پیپر کو جلا دینا چاہیے۔

ہندوستان میں تا دمِ تحریر (27 جون 2009) سوائن فلو سے متاثر لگ بھگ پانچ درجن افراد کی نشاندہی ہوئی ہے۔ ان میں بیشتر افراد بروقت طبی امداد ملنے کی وجہ سے صحت یاب ہو کر اپنے گھروں کو رخصت ہو چکے ہیں۔

ہمارے ملک میں سوائن فلو سے متاثر افراد آندھرا پردیش، دہلی اور پنجاب کی ریاستوں میں پائے گئے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ تر اس بلا کو امریکا کی مختلف ریاستوں سے لے کر آئے تھے۔ بھارت سرکار نے ملک کے تمام عالمی ہوائی اڈوں پر اس مرض کی چیکنگ کے لیے خصوصی انتظامات کر رکھے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ملک میں ابھی تک اس مرض سے متاثر کسی مریض کی موت واقع ہونے کی اطلاع نہیں ہے۔

سوائن فلو کے علاج کے لیے اینٹی وائرل دوائیں دی جاتی ہیں۔ ان میں ٹیمی فلو نام کی دوا خاصی موثر ثابت ہوئی ہے۔ یہ دوا خاصی مہنگی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وبا کو خنزیروں میں کنٹرول کرنے کے لیے کافی عرصے سے ایک ویکسین استعمال میں ہے لیکن وہ انسانوں میں پیدا ہوئے سوائن فلو میں کارگر نہیں ہے۔ ایک ہندوستانی سے دوسرے ہندوستانی میں اس وائرس کے منتقل ہونے کے واقعات معدودے چند ہیں۔ بشمول ہندوستان تمام ممالک میں زور شور سے انسانوں کے سوائن فلو کی ویکسین کی ریسرچ جاری ہے۔ حال میں سوئٹزرلینڈ کی ایک دواساز کمپنی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے سوائن فلو کی ویکسین تیار کرلی ہے لیکن اس کو بازار میں لانے کے لیے چند ہفتے مزید لگ جائیں گے۔

عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جب بھی کوئی مرض یا وبا تیزی سے پھیلتی ہے تو ماہرین طب اور سائنسداں اس کا علاج دریافت کرنے یا اس سے بچاؤ کی ترکیبیں تلاش کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس وبا کی حقیقی وجہ کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی جاتی۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان جب بھی خدائی قانون سے روگردانی کرتا ہے تو وہ کسی نہ کسی بلا میں ضرور گرفتار ہوتا ہے۔ سوائن فلو کی حالیہ وبا کی وجہ بھی یہی ہے کہ انسان نے سیکڑوں قسم کے ان جانوروں اور پرندوں کے گوشت کو چھوڑ کر جو حلال تھے، ایک ایسے جانور کے گوشت کو غذا میں شامل کیا جس کو مالک ارض وسما نے چھونے کو منع فرمایا تھا۔ حال ہی میں ایک امریکی نیوز ایجنسی نے یہ بات کہی ہے کہ اسلامی ممالک میں سوائن فلو کی وبا پھیلنے کا کوئی امکان نہیں ہے کیوں کہ مسلمان خنزیر کے گوشت کو استعمال کرنا تو درکنار اس جانور سے اپنا جسم چھو جانے کو بھی حرام سمجھتے ہیں۔

□□□

پتہ:
Al-Huda Muslim Edu. Society U.P.,
The Friends of Nature,
Lucknow

سائنس کی کہانیاں (حصہ اوّل)

مصنف: سکٹف اور سکٹف / مترجم: ڈاکٹر انیس الدین ملک

سائنس ہماری زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اس کے بغیر موجودہ زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔
زیر نظر کتاب میں کہانیوں کی مدد سے مختلف اشیا کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے اور ان سے متعلق تمام جانکاری بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 152، قیمت -/18 روپے

کیمیا کی کہانی

مصنف: سید شہاب الدین دسنوی

انسان فطری طور پر تجسس پسند واقع ہوا ہے۔ کیا، کیوں اور کیسے وغیرہ سوالات انسان کے ذہن میں ہمیشہ گونجتے رہے ہیں اور یہی سوالات مختلف ایجادات و انکشافات کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ ''کیمیا کی کہانی'' میں بعض اہم عناصر مثلاً آکسیجن، بجلی، سوڈا، کیلشیم، میگنیشیم اور ریڈیم وغیرہ کی دریافت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

صفحات: 343، قیمت -/140 روپے

خان قمر الزماں

ای بکس یعنی الیکٹرانک کتابیں

جس طرح آج موبائل کے استعمال نے دس پندرہ سال قبل یہ مروج خط وکتابت کے عمل کو متاثر کیا ہے اسی طرح آنے والے دس پندرہ برسوں میں ای بکس (e-books) کاغذ پر چھپی ہوئی کتابوں کو متاثر کرنے والی ہیں۔ اس وقت دنیا بھر میں کتابوں کا کاروبار ایک سو پچاس ملین ڈالر سے زیادہ ہے۔ پچھلے چند برسوں سے متعارف ہوئی۔ ای بکس (e-books) نے تا حال اس کاروبار کے پندرہ فی صدی حصے پر قبضہ جمالیا ہے۔ کافی تیز رفتاری سے ترقی کرنے والے اس طریقے سے اردو کی کتابی دنیا بھی خود کو دور نہیں رکھ سکتی۔ اس لیے اردو کتابوں کے کاروبار سے وابستہ سبھی لوگوں کو ''لاگ آن "Log-on" کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے تاکہ اردو ادب کی مختلف اصناف نظمیں، غزلیں، کہانیاں، افسانے، ہماری تہذیب وثقافت کی ترجمان تصانیف مستقبل کی نئی نسلوں تک پہنچائی جاسکیں۔ بیس سال بعد جو نسل موجود ہوگی وہ زیادہ تر اس طریقے کو استعمال کرنے والی ہوگی۔

پچھلے چند برسوں سے ای میل (e-mail)، ای کامرس (e-commerce)، ای لرننگ (e-learning)، ای ایجوکیشن (e-education)، نے دنیا میں اپنے قدم جما لیے ہیں۔ اب ای بک (e-books) سامنے آرہی ہیں۔ ان سب ناموں میں ''ای'' (e) کا مطلب الیکٹرانک (electronic) ہے۔ ای بک یعنی الیکٹرانک کتاب، یہ کتاب کاغذ پر چھپی ہوئی کتاب سے بالکل مختلف ہوگی۔ وہ دن دور نہیں جب آپ کو اپنی پسندیدہ کتاب ڈاک سے منگانی پڑے یا کتابوں کی دکان پر جاکر لینی پڑے، یا پھر کسی دوسرے شہر جانے والے کے ہاتھوں کتاب منگوانے کا لمبا انتظار کرنا پڑے۔ اس طریقے سے تیار ہونے والی کوئی کتاب ادھر تیار ہوئی اور ادھر آپ اسے حاصل کرکے پڑھنا شروع کرسکتے ہیں۔

لکھنے کی شروعات کرنے والوں نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ پتھروں پر حرف کھودنے، دھات کی تختیوں پر کندہ کرنے، چمڑے اور پتوں پر لکھنے، کاغذ پر لکھنے اور چھپنے کا عمل ترقی کرکے نہایت تیز رفتار اور آسان طریقے یعنی ای بک (e-book) کی شکل میں سامنے آئے گا۔

ای بک (e-book) یعنی الیکٹرانک کتاب میں پڑھنے کے مواد کو ڈیجیٹل شکل میں محفوظ کیا جاتا ہے۔ اسے پڑھنے کے لیے آپ کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، خصوصی ای بک ریڈر (e-book reader) اور موبائل کے اسکرین کا بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ ای بک (e-book) ریڈر یعنی الیکٹرانک کتاب پڑھنے کے لیے بنایا گیا عام کتابی سائز کا ایک چھوٹا سا کمپیوٹر نما آلہ ہے۔ کمپیوٹر لیپ ٹاپ (Lap-top) بھی ای بک ریڈر کا کام انجام دے سکتا ہے۔ فی الحال مارکیٹ میں ایمیزان کمپنی کے 'کنڈلز' اور سونی ای بک ریڈر کافی شہرت یافتہ ہیں۔ اس طریقۂ کار کی شروعات انٹرنیٹ کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ ہی ہوچکی تھی۔ آج سے دس سال قبل ہی مغربی ممالک میں ای پبلشروں (e-publishers) نے کتابوں کے الیکٹرانک ایڈیشن فراہم کرنا شروع کردیے تھے۔

الیکٹرانک کتاب (e-book) تیار کرنے کے لیے مصنف سوفٹ ویئر میں اپنا مواد تیار کرکے وہ فائل پبلشر کی ویب سائٹ پر بھیجتا ہے۔ پبلشر مصنف سے ضروری معاہدہ کرنے کے بعد اپنی ویب سائٹ سے اس کتاب کو فروخت کرتا ہے۔ دنیا بھر میں کہیں بھی اس کتاب کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کسی پبلشر کی ویب سائٹ سے ای بک حاصل کرنے کے لیے اس کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔ قیمت ادا کرنے پر ہی پبلشر خریدار کو خصوصی طریقے اور pass word سے آگاہ کرتا ہے۔ ڈیجیٹل رائٹ مینجمنٹ (Digital Right Management) قوانین کے مطابق آپ خریدی ہوئی یعنی ڈاؤن لوڈ کی ہوئی الیکٹرانک کتاب دوسروں کو فروخت نہیں کرسکتے جبکہ سوفٹ ویئر سکیوریٹی لاک کی مدد سے کتابوں کو پرنٹ کرنے کی سہولیات ہوتی ہیں۔ اگر کسی مصنف کو اپنی کتاب ای بک (e-book) طریقے سے تیار کرکے فوراً پوری دنیا کے سامنے پیش کرنا ہو تو وہ اس طریقے کے پبلشروں سے رابطہ کرکے اپنی کتابوں کو شائع کرواسکتا ہے۔ جس طرح کاغذ پر چھپی ہوئی کتابوں کے پبلشر کتابوں کی اشاعت کی تعداد، ڈیمانڈ، صفحات کی تعداد اور قیمت کو مدنظر رکھ کر مصنف کو رائلٹی دیتے ہیں، بالکل اسی طرح ای بک کے پبلشر بھی مصنف کو اس حساب سے رائلٹی دیتے ہیں کہ اس کی کتاب کتنے لوگوں نے ڈاؤن لوڈ کی، کتاب کی مانگ کتنے عرصے تک رہی وغیرہ۔

فرض کیجیے اگر کوئی شخص امریکا کے کسی شہر میں انڈیا کے کسی مصنف کی اردو میں تحریر کردہ کتاب خریدنا چاہتا ہے اور وہ کتاب امریکا میں دستیاب نہیں ہے، اس صورت میں وہ شخص خط وکتابت، پارسل یا کسی انڈیا کے دوست سے رابطہ کرکے وہ کتاب ملنے کا انتظار کرے گا۔ لیکن اگر وہی کتاب ای بک

(e-book) طریقے سے کسی بھی پبلشر نے دنیا میں کہیں بھی شائع کی ہو تو وہ شخص امریکا میں یا دنیا میں کسی بھی جگہ فوراً اس کتاب کو حاصل کرسکتا ہے۔ اس طریقۂ کار میں ایک اور بڑا فائدہ پبلشروں کو بار بار دوسرا، تیسرا ایڈیشن شائع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر مصنف کو پہلے ایڈیشن میں کچھ مزید اضافہ یا تبدیلی کرنا ہو تو وہ نہایت آسانی سے کرسکتا ہے۔ ترمیم اور اضافے کا یہ طریقہ عام کتابوں کے مقابلے میں نہایت آسان اور سستا ہوتا ہے۔

بے شمار فائدوں کے ساتھ ساتھ اس طریقۂ اشاعت میں کچھ نقصانات اور خطرات بھی ہیں۔ جیسے الیکٹرانک طریقے سے پڑھنا یعنی اسکرین پر آنے والے صفحات کو پڑھنے سے آنکھوں پر تناؤ پڑنے سے تھکان ہوگی، وہیں ای.بک پڑھنے سے پہلے کمپیوٹر، لیپ ٹاپ یا ریڈر شروع کرو، فائل میں جاؤ اور پھر کتاب پڑھو جبکہ کاغذ کی کتابوں کو الماری سے نکالو اور فوراً پڑھنا شروع کردو۔ کاغذ کی کتابوں کا ڈھونڈنا اور حاصل کرنا ایک محدود دائرے میں ہوتا ہے جبکہ ای.بک طریقے سے ہم پوری دنیا میں شائع ہونے والی کتابوں سے فوراً واقف ہوسکتے ہیں۔ صرف ریڈر یا موبائل کے ذریعے ہزاروں ای.بک ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائی جاسکتی ہیں۔ ایک ہی وقت میں کئی حوالے دیکھے جاسکتے ہیں۔ ریڈر میں کتاب کے مطلوبہ صفحات پر نشان لگا کر الفاظ کی جسامت چھوٹی بڑی کرکے ضرورت کے مطابق کاغذ پر چھپی ہوئی حالت میں حاصل کرسکتے ہیں۔

وقت کے بدلاؤ کے ساتھ ساتھ نئے زمانے کے ادبی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ای.آتھر (e-Author) یعنی الیکٹرانک مصنف بھی درکار ہوں گے۔ آنے والے زمانے کے مصنفوں کو اپنی تصانیف پڑھنے والوں کے تقاضے دھیان میں رکھ کر تیار کرنے کی ضرورت ہوگی۔ پرانی معیاری کتابیں بھی اس طریقۂ کار کے ذریعے شائع ہونے کے امکانات ہیں۔ آج کتابوں کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ کاغذ کا خرچ، ٹائپ سیٹنگ کا خرچ، سیاہی، چھپائی، بائنڈنگ، پیکنگ، پارسل، فروخت کرنے والوں کا کمیشن وغیرہ کے علاوہ پبلشر کا نفع بھی ہے۔ یہ سب خرچ نکال کر ہی مصنف کو رائلٹی ملتی ہے جو بہت کم ہوتی ہے۔

ای.بک کے ذریعے یہ تمام اخراجات صفر ہوں گے کیونکہ درمیان کے سب کاموں کی ضرورت ہی نہیں۔ ادھر مصنف نے لکھا اور ادھر اس کی اشاعت ہوگئی۔ جس کی وجہ سے پڑھنے والوں کو کم قیمت میں کتابیں پڑھنے کو ملیں گی اور مصنفوں کو بھی معقول معاوضے ملیں گے۔ ادبی دنیا میں اس بڑے بدلاؤ کو ہم نظرانداز نہیں کرسکتے اس لیے ہمیں بھی لاگ آن کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

□□□

پتہ:
Educationar & Career Counsellor
Shah Babu College,Patur-444501,Akola (M.S.)

ہندوستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی.آر. گیڈگل، پروفیسر ایم.صدیقی

ہندوستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہوگئے بلکہ اسی کے بعد ہندوستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ الثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے وہی صحیح معنوں میں ہندوستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت -/130 روپے

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی.کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پوری کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت -/149 روپے

محمد اعجاز

بیرونی ممالک میں تعلیم کے لیے ٹیسٹ

بیرونی ممالک میں پڑھائی کے لیے کئی طرح کے ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ ان میں TOEFL, MCAT, SAT, GMAT, GRE وغیرہ اہم ہیں۔ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں اور دیگر اہم تعلیمی اداروں کے مختلف کورسوں میں داخلے کے لیے ان امتحانات کو منظوری حاصل ہے۔ یونائٹیڈ اسٹیٹس آف امریکا یعنی یو ایس اے کے اداروں میں داخلے کے لیے ٹی او ای ایف ایل، جی میٹ، ایس اے ٹی اور اے سی ٹی کا اسکور چاہیے۔ جبکہ برطانیہ کے اداروں میں داخلے کے لیے جی سی ای پاس کرنا ہوگا۔ کناڈا، آئرلینڈ اور نیوزی لینڈ میں پڑھنے کے لیے ٹی او ای ایف ایل یا آئی ای ایل ٹی ایس، پاس کرنا کافی ہے۔ آسٹریلیا کے تقریباً سبھی تعلیمی اداروں میں آئی ای ایل ٹی ایس کا اسکور مقبول ہے۔ دنیا کے دیگر ممالک میں پڑھنے کے لیے بھی انھی امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔ آیئے ان امتحانات کے بارے میں تفصیل سے جانتے ہیں:

ٹیسٹ آف انگلش ایز اے فارن لنگویج (TOEFL)

امریکا اور کناڈا کی یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے سے پہلے امریکن انگریزی میں آپ کے انگریزی علم کا امتحان ٹیسٹ آف انگلش ایز فارن لنگویج (ٹی او ای ایف ایل) کے ذریعے لیتے ہیں۔ یہ ایجوکیشنل ٹیسٹنگ سروس کا ٹریڈ مارک ٹیسٹ ہے۔ اس کے اسکور کی ضرورت امریکا سے باہر کے درخواست دہندوں کو انگریزی بولنے والے کالجوں یا یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے کے وقت ہوتی ہے۔ امریکا سمیت دنیا کے 110 ممالک کے اداروں میں اس کا اسکور مقبول ہے۔

ٹی او ای ایف ایل کا آغاز 1964 میں ہوا تھا۔ ان دنوں ہر سال تقریباً دو کروڑ طلبہ اس میں شریک ہوتے ہیں۔ پہلے یہ پی بی ٹی یعنی پیپر بیسڈ ٹیسٹ اور سی بی ٹی یعنی کمپیوٹر پر منحصر ٹیسٹ ہوتا تھا لیکن 2005 کے بعد زیادہ تر اداروں میں آئی بی ٹی یعنی انٹرنیٹ بیسڈ ٹیسٹ لیا جاتا ہے۔ سی بی ٹی میں آپ کمپیوٹر پر ہدایات پڑھ کر سوالوں کے جواب دے سکتے ہیں۔ ٹی او ای ایف ایل ٹیسٹ میں خاص طور پر پڑھنے، سننے اور لکھنے کا امتحان ہوتا ہے۔ ان تینوں میں کامیاب ہونے کے لیے آپ کا انگریزی ذخیرۂ الفاظ وسیع ہونا چاہیے۔ ٹی او ای ایف ایل کے فارم کے لیے آن لائن رجسٹریشن کراسکتے ہیں۔ ویب سائٹ ہے: www.ets.org

گریجویٹ مینجمنٹ ٹیسٹ (GMAT)

یہ ٹیسٹ بزنس کالجوں اور بزنس اسکولوں میں داخلے کے لیے ہوتا ہے۔ دنیا میں ایسے کم از کم ایک ہزار مینجمنٹ پروگرام ہیں جن میں جی میٹ اسکور ضروری ہے۔ جی میٹ عموماً تین سیکشن میں منقسم ہوتا ہے:

اینالیٹیکل رائٹنگ اسیس منٹ (Analytical Writing Assessment)۔ اس میں دو مضمون لکھنے ہوتے ہیں اور ہر ایک کے لیے تیس منٹ کا وقت دیا جاتا ہے۔

Quantitative: اس میں 75 منٹ میں 37 معروضی سوالات حل کرنے ہوتے ہیں۔

وربل سیکشن (**Verbal Section**): اس میں 75 منٹ میں 41 سوال حل کرنے ہوتے ہیں۔ جی میٹ میں انگریزی زبان میں مکمل مہارت پر خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ زیادہ تر بزنس ادارے جی میٹ کے پانچ سال تک کے اسکور کو کام میں لاتے ہیں۔ اس کے لیے آن لائن درخواست دی جاسکتی ہے۔ ویب سائٹ ہے: www.mba.com

انٹرنیشنل انگلش لنگویج ٹیسٹنگ سسٹم (IELTS)

آئی ای ایل ٹی ایس بھی انگریزی میں مہارت کا اندازہ لگانے والا ٹیسٹ ہے۔ اس کا انعقاد برٹش کونسل، کیمبرج یونیورسٹی، ای ایس او ایل اور آئی ڈی پی ایجوکیشن، آسٹریلیا کے مشترکہ طور پر کرتے ہیں۔ امیدوار اس کے دو ماڈیول میں سے کوئی ایک منتخب کرسکتا ہے (اکیڈمک اور جنرل ٹریننگ)۔ اکیڈمک، تعلیمی اداروں میں داخلے کے لیے ہے جبکہ جنرل ٹریننگ نان اکیڈمک ٹریننگ کے لیے ہوتا ہے۔ آئی ای ایل ٹی ایس کو آسٹریلیا، برطانیہ، کناڈا، آئرلینڈ، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ کے تعلیمی اداروں کے علاوہ کچھ امریکی ادارے بھی قبول کرتے ہیں۔ کناڈا اور آسٹریلیا میں سیر وسیاحت کے لیے بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں ترسیل کے چاروں طریقوں یعنی سننے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی جانچ کی جاتی ہے۔ اس کا ایک سال میں 48 بار انعقاد کیا جاتا ہے اور دنیا میں تقریباً 300 ٹیسٹ سنٹر ہیں۔ بھارت میں اس کے قریب 55 ٹیسٹ سنٹر ہیں۔ اس میں شامل ہونے کی فیس 7200 روپئے ہے۔ ویب سائٹ ہے: www.ieltsindia.com

اسکالسٹک اپٹی ٹیوڈ ٹیسٹ (SAT)

امریکا کے موقر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے اسکالسٹک اپٹی ٹیوڈ ٹیسٹ منعقد ہوتا ہے۔ یہ امتحان دنیا کا سب سے بڑا غیر سرکاری امتحانی ادارہ ای ٹی ایس (Educational Testing Service) منعقد کراتا ہے۔ امتحان کے ذریعے آپ کے سمجھنے کی صلاحیت، ویب کا علم، قوت استدلال

کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ یہ ٹیسٹ دس حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ اس ٹیسٹ کے ذریعے ادارہ یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ امیدوار کا متعلقہ مضمون میں علم کس سطح کا ہے۔ اس ٹیسٹ میں کامیاب طلبہ کا ماننا ہے کہ رائٹنگ اور ریڈنگ کو پاس کرنے کے لیے ذخیرۂ الفاظ کا وسیع ہونا ضروری ہے۔ اس ٹیسٹ کی فیس تقریباً 2600 روپئے ہے۔ ویب سائٹ ہے: www.collegeboard.com

گریجویٹ ریکارڈ اگزامنیشن (GRE)

امریکا کے کئی اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ GRE یعنی گریجویٹ ریکارڈ اگزامنیشن کے نمبروں کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ جی آر ای لگ بھگ SAT کی ہی طرح ہوتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ GRE کمپیوٹر پر مبنی امتحان ہے، جبکہ SAT نہیں۔ جی آر ای میں انالیٹیکل رائٹنگ میں دو مضمون ہوتے ہیں۔ کوانٹی ٹے ٹیو ملٹی پل چوائس میں 28 سوال ہوتے ہیں۔ جبکہ وربل ملٹی پل چوائس کے تیس سوال۔ GRE میں شامل ہونے کی فیس تقریباً -/6800 روپئے ہے۔ ویب سائٹ ہے: www.ets.org

میڈیکل کالج ایڈمیشن ٹیسٹ (MCAT)

امریکا کی نارتھ امریکن یونیورسٹی اور کناڈا کے اعلیٰ درجے کے میڈیکل کالجوں میں داخلے کے لیے اے اے ایم سی (ایسوسی ایشن آف امریکن میڈیکل کالج) میڈیکل کالج ایڈمیشن ٹیسٹ یعنی MCAT منعقد کرتا ہے۔ امتحان کے ذریعے طلبہ کی ذہنی مہارت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ MCAT کا امتحان سال میں 22 بار لیا جاتا ہے۔ امتحان کے چار سیکشن ہوتے ہیں۔ وربل ریزننگ، فیزیکل سائنس، بایولوجیکل سائنس اور رائٹنگ سیمپل، پہلے تین سیکشن میں ملٹی پل چوائس ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ رائٹنگ سیمپل کے سیکشن میں آپ کو دو چھوٹے مضمون لکھنے ہوتے ہیں۔ تین ملٹی پل سیکشن کے لیے آپ کے اسکور کا رینج 1 سے 15 ہوسکتا ہے۔ آپ کا کل زیادہ سے زیادہ اسکور 45 ہوسکتا ہے لیکن اسکور 30 ہونے پر بھی آپ کے پاس میڈیکل کالج میں داخلہ پانے کا اچھا موقع ہوتا ہے۔ وربل ریزننگ سیکشن میں آپ کو 60 ملٹی پل چوائس سوالات کے جوابات دینے ہوتے ہیں۔ ویب سائٹ ہے:

www.aamc.org.mcat

پی کیٹ (PCAT)

امریکا کے فارمیسی کالجوں میں داخلہ لینے کے لیے پی کیٹ یعنی فارمیسی کالج ایڈمیشن کا امتحان منعقد ہوتا ہے۔ اسی امتحان کے ذریعے اکیڈمک مہارت اور سائنٹفک تجربے کو جانچا جاتا ہے۔ امتحان کے تحت ایک میڈیکل مضمون اور مندرجۂ ذیل سیکشن کے 300 ملٹی پل سوالوں کے جواب دینے ہوتے ہیں۔

وربل سیکشن: اس سیکشن کے 50 سوالات کے ذریعے ذخیرۂ الفاظ اور انالاجی کا امتحان لیا جاتا ہے۔

کوانٹی ٹے ٹیو سیکشن: آپ کی حسابی صلاحیت کا تخمینہ لگانے کے لیے اس سیکشن سے 65 سوالات پوچھے جاتے ہیں۔

بایولوجی: اس میں حیاتیات سے متعلق 50 سوالات پوچھے جاتے ہیں۔

کیمسٹری: اس میں کیمسٹری سے متعلق 60 سوالات پوچھے جاتے ہیں۔

ریڈنگ: اس سیکشن میں سائنٹفک مضمون کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا ہوتا ہے۔

ٹوایک (TOEIC)

ٹوایک یعنی ٹیسٹ آف انگلش فار انٹرنیشنل کمیونی کیشن۔ دنیا کے چالیس لاکھ سے زیادہ بزنس ادارے انگریزی زبان کا امتحان لینے کے لیے ٹوایک کا استعمال کرتے ہیں۔ اس امتحان میں کارپوریٹ ڈیولپمنٹ، فائنانس اور کارپوریٹ پراپرٹی سے متعلق سوالات پوچھے جاتے ہیں۔ ٹوایک میں کامیاب ہونے کے لیے تجارت سے متعلق ہر شعبے میں آپ کی انگریزی زبردست ہونی چاہیے۔ تیاری کے لیے آپ کو ایسا ماحول تیار کرنا چاہیے جس میں آپ روزمرّہ کی ساری بات چیت انگریزی زبان میں کریں۔ بہتر ہوگا کہ آپ وائس آف امریکا سینس، سی این این اسکائی نیوز، بی بی سی جیسے چینل دیکھیں، انگریزی کے قومی اخبارات پڑھیں اور ای میل لکھنے کی عادت ڈالیں۔ کچھ وقت انٹرنیٹ کے لیے بھی نکالیں۔

میلر انالاجی ٹیسٹ (MAT)

میلر انالاجی ٹیسٹ امریکا کے گریجویشن سطح کے اسکولوں میں داخلے کے لیے منعقد کیا جاتا ہے۔ سماجیات، تعلیم اور کلاسیکی ادب سے متعلق مضامین میں داخلے کے لیے اس کے اسکور کو دیکھا جاتا ہے۔ ایک گھنٹے کے اس ٹیسٹ میں پارشیل انالاجی پر مبنی 120 سوالات ہوتے ہیں۔ ویب سائٹ ہے:

www.milleranalogies.com

جنرل سرٹیفکیٹ آف ایجوکیشن (GCE)

برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم اور پروفیشنل تعلیم حاصل کرنے کے لیے GCE بنیادی صلاحیت فراہم کرتا ہے۔ اس میں دو سطح پر امتحان ہوتا ہے۔ A سطح کا اسکور یونیورسٹی میں بڑی سطح پر کورس کرنے کی اہم بنیاد ہوتا ہے۔ ویب سائٹ ہے: www.britishcouncil.org

لا اسکول ایڈمیشن ٹیسٹ (LSAT)

امریکا اور کناڈا کے لا کالجوں میں داخلے کے لیے یہ ٹیسٹ لیا جاتا ہے۔ یہ جون، اکتوبر، دسمبر اور فروری میں منعقد کیا جاتا ہے۔ ویب سائٹ ہے:

www.lsac.org

□□□

پتہ:
S/o Abdul Waris, Raja Tola, Harlakhi,
Madhubani, Bihar-847225

شہپر رسول

زبیر رضوی سے گفتگو

● زبیر رضوی 1936 میں امروہہ (یو. پی.) کے ایک ممتاز دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار اردو کے سینئر شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی ادبی شخصیت بڑی ہمہ جہت اور متنوع ہے۔ نظم ونثر کی متعدد اصناف کے توسط سے انھوں نے اپنی تخلیقی انفرادیت کے نقوش ثبت کیے ہیں۔ کلاسیکی شعری اصناف مثلاً غزل، نظم، قطعہ ورباعی کے ساتھ ہی گیت، آزاد نظم، نثری نظم، اور ہائیکو وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی کلیات ''پورے قد کا آئینہ'' کے نام سے شائع ہوئی جس میں آٹھ شعری مجموعوں کا انتخاب شامل ہے۔ حال ہی میں ان کی نظموں کا مجموعہ ''سبزۂ ساحل'' شائع ہوا ہے۔ علاوہ ازیں ''نئی نظم: تجزیہ اور انتخاب'' کے نام سے نئی نظم پر ترتیب دی جانے والی کتاب بھی قابلِ توجہ ہے۔ نثر میں غالب پر ان کی دو کتابیں ''غالب اور فنونِ لطیفہ'' اور ''تماشا مرے آگے'' غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی نے شائع کی ہیں۔ ''اردو ڈرامے کا سفر'' کے عنوان سے مین اسٹریم تھیٹر پر آٹھ ڈراموں پر مبنی ان کی مرتب کردہ کتاب حال ہی میں نیشنل بک ٹرسٹ نے شائع کی ہے جس کا مقدمہ بطور خاص مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔

اس کے علاوہ فل لینتھ اور یک بابی اردو ڈراموں پر مشتمل دو جلدوں میں کیا جانے والا انتخاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی نے شائع کیا ہے۔ نیز گذشتہ دنوں ہندو پاک سے بیک وقت شائع ہونے والی ان کی خودنوشت سوانح، ''گردشِ پا'' کا بھی اردو کے ادبی حلقوں میں خاصا چرچا رہا ہے۔

زبیر رضوی کی رنگارنگ شخصیت کا ایک رنگ میڈیا سے متعلق بھی ہے۔ بحیثیت میڈیا پرسن اور براڈ کاسٹر کے ان کے تجربات تقریباً تیس برسوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ 1988 میں انھوں نے سیول اولمپک اور 1992 میں بیجنگ ایشین گیمس نیز کرکٹ ورلڈ کپ دہلی کا کوریج کیا۔ ڈھاکا میں پاکستانی فوج کی خود سپردگی کی کمینٹری اور اٹاری بارڈر سے اٹل بہاری واجپئی سے نواز شریف کی ملاقات کی ٹی.وی کمینٹری بھی زبیر رضوی ہی نے پیش کی۔ موصوف سینئر ڈائرکٹر (اسپورٹس) کے منصب سے 1993 میں سبکدوش ہوئے۔

ادبی صحافی اور لٹریری ایکٹیوسٹ کے طور پر بھی زبیر رضوی اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں۔ ''ذہنِ جدید فورم'' اور ''جن وادی لیکھک سنگھ'' جیسی ادبی اور ثقافتی تنظیموں کے تحت ان کی سرگرمیوں کی بات کی جائے، تھیٹر، رقص، مصوری، کارٹون، فلم اور فوٹوگرافی جیسے فنونِ لطیفہ سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کا ذکر کیا جائے، اردو اکادمی دہلی کے فعال سکریٹری کی شکل میں ان کی کارکردگی کو دیکھا جائے، اردو مشاعرے کے اسٹیج سے ان کی نصف صدی پر پھیلی ہوئی وابستگی پر نظر کی جائے یا ان کے سہ ماہی رسالے ''ذہنِ جدید'' کے معیار اور منفرد شناخت کو موضوعِ گفتگو بنایا جائے، ان کے ہمہ جہت اوصاف نیز شعروادب اور اس کے متعلقات سے ان کے غیر معمولی شغف کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ گذشتہ دنوں ان سے کی جانے والی ایک ادبی گفتگو نذرِ قارئین ہے۔

س: زبیر صاحب۔ آپ کے وطن امروہہ کی ایک تہذیبی اور ادبی تاریخ ہے، عام طور پر لوگ اس معاملے میں خاصے جذباتی ہوجاتے ہیں۔ آپ اپنے وطن اور جائے پیدائش سے متعلق کن حوالوں سے گفتگو کرنا چاہیں گے؟

ج: جی ہاں! امروہہ میری جائے پیدائش ہے اور آبائی وطن بھی۔ میری پرورش دینی ماحول میں ہوئی۔ میرے دادا مولانا احمد حسن محدث تھے جو مولانا قاسم نانوتوی کے شاگرد عزیز تھے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کے معاصر محدث اور عالمِ دین تھے۔ میرے لڑکپن والی سوجھ بوجھ میں جب باتوں کو، ماحول کو اور شہر کو سمجھنے کی کونپلیں پھوٹنے لگیں تو میری گھریلو زندگی اور گھر سے باہر کے ماحول میں میرے دادا کے تذکرے، اہلِ صلیب سے ان کے مناظرے اور جنات کو درس دینے کے واقعات کی بڑی طلسماتی کہانیاں اور قصے ابھی بڑے بوڑھوں کی گفتگو میں شامل تھے۔ ان دنوں میرے کانوں میں اکثر آوازیں آتی تھیں ''میاں بڑے دینی ورثے کے وارث ہو''، میری والدہ کو بھی اس ورثے کا شدید احساس تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ مولانا کے آٹھ پوتوں میں سے کوئی تو ان کے چھوڑے ہوئے ورثے اور دینی تفکر کا سچا وارث بن جائے مگر ایسا ہو نہ سکا۔ میرے والد خود بھی اپنے والد کی دینی اور علمی شخصیت کو اپنے وجود میں پوری طرح تحلیل نہ کرسکے اور حیدرآباد آکر سرکاری اسکولوں میں اردو اور عربی پڑھانے لگے۔ میرا بچپن امروہہ میں قسطوں میں گزرا۔ میں اپنے اسی بچپن کو پوٹلی میں باندھ کر والد کے ہمراہ دوسری بار حیدرآباد آگیا۔ میں نے پولیس ایکشن کے فوری بعد والے حیدرآباد میں ہائر سیکنڈری والی تعلیم کے پانچ برس گزارے۔ جو سوجھ بوجھ والی کونپلیں امروہہ میں پھوٹنے لگی تھیں ان میں ذہانت وسنجیدگی کے برگ وبار اسی زمانے سے بہار دینے لگے تھے۔ امروہہ میری پرورش اور تہذیب وتربیت کا ایک ایسا قدیم مقام تھا جس میں دین اور عقیدے کی صدیاں مسجدوں، مدرسوں اور خانقاہوں کے حوالے سے میرے

حافظے کا حصہ بنی ہوئی تھیں۔ حیدرآباد نے ہندوستان کی سب سے بڑی مسلم ریاست کے آمرانہ اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کا وہ نقشہ میری آنکھوں میں منجمد کردیا جس نے مجھ پر ایک قوم کے عروج و زوال کے اسباب و رموز منکشف کیے، اس طرح امروہہ اور حیدرآباد دونوں میرے تخلیقی آمیزے میں اپنے تلخ و ترش شامل کرتے رہے ہیں۔ عمر کے ابتدائی شب و روز ادیب و فنکار کی شخصیت کا ایسا حصہ بن جاتے ہیں جو اس کی تحریر اور فن پاروں میں زندگی کے آخری سانس تک ابھرتا ڈوبتا رہتا ہے۔ اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ تخلیقی ادب اور اس کی رونقیں بڑی حد تک ادیب کی ذات اور اس کے سوانحی گلیاروں سے گزرتی رہتی ہیں۔

س: کیا آپ نے بھی شاعری کا آغاز غزل ہی سے کیا تھا؟ اس سلسلے میں کوئی خاص بات آپ قارئین کو بتانا چاہیں گے؟

ج: شہپر صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ جب میں دوسری بار حیدرآباد ہائر سیکنڈری کرنے کے لیے آگیا تو میرے پاس استاد کوثر امروہوی کی دی ہوئی پانچ چھ غزلیں تھیں۔ مگر جب یہ غزلیں غیر اہم محفلوں میں سناتے سناتے باسی ہوگئیں تو میں نے اپنے طور پر شعر کہنے کی مشق شروع کردی۔ جی ہاں! پہلے پہل تو غزل ہی کہی تھی جو تقلیدی تھی۔ اسی زمانے میں شاذ تمکنت اور عوض سعید سے دوستی ہوئی۔ یہ دونوں ادب سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے اور مجھ سے زیادہ نئے ادب سے باخبر تھے۔ انھی دوستوں کی مدد سے نئے ادب کے کئی مجموعے پڑھے اور یوں فیض، سردار جعفری، مجاز، ساحر اور مخدوم جیسے شعرا کے نام کانوں میں پڑے اور ادب و شاعری کا سارا ذائقہ ہی بدل گیا۔ اب میں نظم بھی لکھنے لگا تھا اور یہ دونوں دوست جو میری ہی طرح اسکول میں تھے۔ ابھی تک انھوں نے شاعری اور افسانہ نگاری شروع نہیں کی تھی، میرے سامع ہوا کرتے تھے۔

س: ''شاعر کو بعض اوقات راستے کے کسی موڑ پر یا زندگی کی کسی کروٹ پر نظم مل جاتی ہے۔ لیکن عام آدمی کو اس کا احساس تک نہیں ہوپاتا۔'' اس قول کی روشنی میں یہ بتایئے کہ کیا پیدائشی طور پر شاعر ہونے میں کوئی سچائی ہے یا اس معاملے میں ذوق، ماحول اور مشق کی تثلیث معاون ثابت ہوتی ہے؟

ج: جناب آپ نظم لکھنا چاہتے ہیں یا غزل اس کا فیصلہ تو آپ کی افتادِ طبع کرتی ہے۔ اردو ادب میں بطور صنفِ سخن غزل نے عرصے تک تاجداری کی ہے اس لیے غزل کہے بغیر چین بھی نہیں آتا لیکن کب کون سا مشاہدہ، تجربہ، کیفیت، جذبہ یا خیال آپ سے نظم یا غزل لکھوالے اس کی خبر شاعر کو اس وقت ہوتی ہے جب تخلیقی سرشاری اسے کچھ دیر کے لیے ایک ماورائی گم شدگی کا حصہ بنا دیتی ہے۔ شاعری کو الہامی ماننے والے اس ماورائیت کے زیادہ قائل نہیں ہوتے۔ میرے خیال میں غزل کے مقابلے میں نظم کوئی زیادہ پیچیدہ تخلیقی عمل سے عبارت ہے۔ طویل نظم کے برخلاف چھوٹی چھوٹی نظمیں بھی آپ سے کئی طرح کے Perfection کا مطالبہ کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک بات اور عرض کروں کہ نظم کا موضوع یا نفسِ مضمون کتنا ہی اچھوتا یا اثر آفریں ہو مگر نظم محض نفسِ مضمون کے سہارے تن کر کھڑی نہیں ہوتی جس طرح بانوں کا پلنگ اس وقت تک استراحت کا لطف نہیں دیتا جب تک پلنگ کے آخری سہارے پر ادوائن سلیقے سے نہ کسی جائے یعنی ہر نظم، پلنگ کی طرح اپنی ادوائن کا بھی تقاضا کرتی ہے۔

س: زبیر صاحب آپ نے نظم اور غزل کے تعلق سے بڑی معنی خیز گفتگو کی۔ حالانکہ میرے سوال کا ایک حصہ ابھی باقی رہ گیا ہے۔ خیر چھوڑیے۔ اب میں ایک طویل سوال کرنے والا ہوں۔ راجندر سنگھ بیدی سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا پریم چند سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں تو انھوں نے کہا: ''ہاں اسی طرح بڑے ہیں جیسے ایک باپ اپنے بیٹے سے بڑا ہوتا ہے، ان کے یہاں نفسیاتی حقائق کھل کر سامنے نہیں آئے۔ اب افسانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔'' زبیر صاحب اگر ہم شاعری کے سلسلے میں گفتگو کریں اور غالب سے متعلق یہی سوال قائم کریں تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

ج: میرا خیال یہ ہے کہ ادیب اور اس کا ادب یا تو اچھا ہوتا ہے یا اہم یا پھر وہ بڑا ہوتا ہے۔ پریم چند اور غالب دونوں ہی بڑے تھے۔ ایک اور بات یہ کہ ادیب اور ادب کے بارے میں رائے زنی کرتے ہوئے ہم خود کو کسی معیار نقد کا پابند نہیں رکھتے اس لیے ہم سامنے کے احوال و کوائف کو پیشِ نظر رکھ کر، جسے معمولی یا اوسط کہنا ہو اس کو اہم یا عظیم بنا دیتے ہیں۔ ہماری تنقیدی تحریروں میں اچھے، اہم اور عظیم کی جس طرح مٹی پلید کی جاتی ہے وہ ہم سب پر واضح ہے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ ادب اور اس کی دوامیت کے فیصلے دس بیس برسوں کے اندر نہیں ہوتے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کون سی بات۔ کون سی نظم، کون سی غزل، کون سی کہانی یا ناول اپنے زمانے اور وقت کو عبور کرتے ہوئے نئے قاری کے لیے خود کو دلچسپ اور اہم بنائے رکھتا ہے۔ رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا'' اپنے موضوع کے پرانے پن کے باوجود ایک بڑے ناول کے طور پر آج بھی نہ صرف زندہ اور Relevent ہے بلکہ تھیٹر اور فلم جیسے میڈیم میں بھی اپنی عصری معنویت کا اعتراف کروا رہا ہے۔ میری نظر میں ادب کی طویل تاریخ میں اپنے ادبی کارناموں اور کارگزاریوں کا ذکر اور حوالہ پانے کا مسئلہ ہر جینوئن ادیب کو اسی طرح پریشان کرتا ہے جس طرح ایک معرکہ پسند جیالا سپاہی مستقبل کے رزمیے میں اپنی جانبازی کا ذکر درج کرانے کے لیے جان پر کھیل جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر ادیب غالب اور منٹو تو ہوتا نہیں کہ جسے اپنے تخلیقی استغراق کے ماورائی لمحوں میں یہ عرفان ہوجائے کہ:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

س: اس وقت میدانِ ادب میں تین نسلیں بیک وقت سرگرمِ عمل ہیں۔ تخلیق کی رنگارنگی ہے، بڑی تنقید کے نام پر چھوٹی چھوٹی باتیں بھی لکھی جارہی ہیں، انعامات اور ایوارڈس اندھے کی ریوڑیوں کی طرح بانٹے جارہے ہیں اور نہ جانے کیا کیا ہو رہا ہے۔ اس ادبی منظرنامے (بلکہ غیر ادبی منظرنامے) سے متعلق آپ کیا سوچتے ہیں؟

ج: میں نے ابھی دیرپا ادبی اقدار رکھنے والے ادب اور اس کے لکھنے والے کی بات کی ہے لیکن موجودہ ادبی منظرنامہ دراصل ان لوگوں کی تگ و دو اور چہل پہل کا منظرنامہ ہے جو اپنی زندگی ہی میں اپنی ادبی حیثیت کو پھلتا پھولتا اور خود کو پھولوں کے ہار اور گجرے پہنے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادب کے رنگ منچ پر مرکزی کردار تخلیق کار کو ادا کرنا ہوتا ہے۔ آج ادھ کچرے ادیب و شاعر اپنے ہاتھوں میں انعامات و اعزازات کی نشانیاں لیے کیمرے کی طرف منہ کیے ہوئے کھڑے ہیں۔ اس سارے کھیل میں بڑی بھومیکا گروہ بندی میں یقین رکھنے والے ان نقادوں نے نباہی ہے جن کا ادبی مستقبل رسائل و جرائد کے توصیفی نمبروں کی اشاعت کے بعد بھی مشکوک ہے۔ اگر ٹالسٹائی، چے خوف اور کافکا جیسے انگنت ادیب نوبل انعام کے اور کرشن چندر، عصمت چغتائی، اختر انصاری، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، قاضی سلیم، اقبال مجید، رتن سنگھ، عمیق حنفی، عابد سہیل اور زاہدہ زیدی جیسے ادیب ساہتیہ اکادمی انعام کے مستحق قرار نہیں دیے گئے تو ان کی ادبی حیثیت پر اس کا کیا اثر پڑا؟ میرا دکھ یہ ہے کہ اس ادبی منظرنامے میں تخلیق یعنی اچھی نظم، اچھی غزل، اچھی کہانی، اچھا ناول یا اچھی کتاب، سب کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور Dummy ایکسٹرا اسٹیج کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔ اس صورتِ حال سے اردو کا ادب خاص طور پر متاثر ہے، دراصل اس کا موجودہ منظرنامہ میڈیا کرس (Mediocres) کا منظرنامہ بن کر رہ گیا ہے۔ افسوس!۔

س: زبیر صاحب! اب میں ایک ایسا سوال کرنا چاہتا ہوں جس میں بیک وقت دو باتیں پنہاں ہیں۔ ایک تو گلوبلائیزیشن کے اس عہد میں آفاقی امداد اور نئے نئے نظریات کی چکاچوندھ میں ہماری زمینی قدروں، مقامی روایات نیز زندگی کے قریبی اور جیتے جاگتے حوالوں کی گمشدگی کا مسئلہ ہے اور دوسرا میڈیا کی ڈکٹیٹرشپ، ہماری گھریلو زندگی میں اس کی بے جا مداخلت اور زبان کے نہ صرف غلط استعمال بلکہ اس کی مٹی پلید کرنے کا معاملہ ہے۔ ایک میڈیا پرسن اور ایک ادیب کی حیثیت سے ان امور پر آپ کا کیا ردِ عمل ہے؟

ج: دیکھیے شہپر صاحب! ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ میڈیا کا عہد ہے۔ اب میڈیا کا کام لوگوں کو صرف معلومات بہم پہنچانا، ان کی تہذیب کرنا اور انھیں تفریح فراہم کرنا ہی نہیں رہ گیا ہے بلکہ فی زمانہ میڈیا کا بنیادی کام اشیائے صَرف کی بڑے پیانے پر تشہیر کرنا تصور کرلیا گیا ہے اور باقی تمام باتیں تشہیر کے فریم کے اردگرد زیبائشی سامان کی طرح ہیں۔ میڈیا کی خرابی یہ ہے کہ وہ خود احتسابی کا عمل نہیں کرتا۔ ممبئی کے تاج محل ہوٹل کے واقعے کو الیکٹرانک میڈیا نے جس انداز سے، جس زاویے سے چاہا کور کیا۔ ہم نے دیکھا کہ ہر نامہ نگار اس وقت ایک بڑا مبصر تھا۔ سامنے کچھ بھی نہیں تھا مگر اندازے اور انکلیں خوب لگائی جارہی تھیں۔ بالآخر سرکار اس پر چونکی اور میڈیا کی سرزنش کی گئی لیکن اس کے باوجود میڈیا وہی کر رہا ہے جو اس کو اپنے تشہیری تقاضوں کے تحت کرنا ہے۔ دنیا کا ہر ملک گلوبلائزیشن کے پھیر میں ہے۔ ہندوستان بھی بڑی تیزی کے ساتھ خود کو وہ شکل دیتا جارہا ہے جو پیدا کردہ صارف کلچر کا تقاضا ہے یا اس کی لازمی ضرورت ہے۔ اس بار لوک سبھا کا الیکشن پوسٹر بازی، باجے تاشے اور جلسے جلوس کے بغیر میڈیا کے ذریعے ہی لڑا گیا۔ آج کا میڈیا معاشرتی قدروں اور تقاضوں کو ٹھوکر پہ رکھتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کس بے خوفی اور کھلے پن کے ساتھ ٹی وی چینلوں پر انڈرگارمینٹس کی تشہیر ہورہی ہے۔ آنے والے دنوں میں انسانی معاشرہ میڈیا کی مٹھی میں ہوگا۔ ڈرائنگ روم اور بیڈروم کا فرق باقی نہ رہے گا، دیکھا جائے تو اب بھی کہاں باقی ہے۔ اب آتا ہے زبان کا مسئلہ۔ میڈیا چیٹ پٹی، کھلے اظہار والی بلکہ گالی نما زبان سے عار نہیں رکھتا۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنی تشہیری زبان میں وہ مزید کھلے پن کو جگہ دے گا۔ جیسے میڈیا کے لیے یہ مثالی تشہیری جملہ ہے ''ٹھنڈا ٹھنڈا کول کول''۔ آنے والے دنوں میں ہمارا ماضی بھی مزید دھندلا دیا جائے گا۔ مثلاً ہماری وہ ویرگاتھائیں کہاں ہیں جن کو ہم چوپاروں پر اجتماعی طور پر سنتے تھے اور وہ ہمارے جذبات میں تازگی نیز جسم میں تھرتھری پیدا کردیتی تھیں۔ آنے والے ہندوستان میں تاج محل، کونارک، اور اجنتا کی گپھاؤں کا مذاق اڑایا جائے گا کیونکہ اس وقت تک ہندوستان نے زمین پر اور زیرِ زمیں بھی نہ جانے کیسے کیسے حیرت انگیز کارنامے انجام دے دیے ہوں گے۔ کل کی نئی نسل اپنے زمانے کے میڈیا کو ماتمی آنکھ سے نہیں بلکہ انسان کے بازاری تقاضوں کی روشنی میں دیکھ کر اپنے ترقی یافتہ ہونے پر فخر کرے گی۔ میڈیا سے متعلق یہ گریہ وزاری ہماری آپ کی نسلوں کا ہی مقدر ہے۔ آنے والے برسوں میں گلوبلائزیشن کے تحت ٹیکنالوجی کے توسط سے ابھی اور بھی پیوندکاری ہوگی۔ آنے والا یُگ اس کو کیا نام دے گا اس پر فی الحال گفتگو کرنا فضول ہے۔

س: آپ ہندی میں بھی لکھتے ہیں۔ جن واوی لیکھک سنگھ کی محفلوں اور مباحثوں میں شریک ہوتے ہیں۔ کیا اردو اور ہندی کی ادبی صورتِ حال میں کوئی نمایاں فرق محسوس کیا ہے آپ نے؟

ج: میں اگر ادب سے اپنی نہایت سرگرم دلچسپی اور وابستگی کے ابتدائی اور

درمیانی عرصے کی بات کروں تو میں کہنا چاہوں گا کہ ہم پر ان دنوں ایک جنون کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ ہر شام ہم ٹولیاں بنا کر اپنے زمانے میں لکھے جانے والے ادب، کتابوں، رسالوں، ادبی رویّوں اور رجحانات پر گھنٹوں گفتگو کرتے رہتے تھے۔ نئے نئے ادبی رسائل کی ورق گردانی اور انھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنے کا پاگل پن سب کو ایک عجیب سے سحر میں گرفتار رکھتا تھا۔ ہماری ان سرگرمیوں میں ہمارے پیش رو ادیب بھی ہمارے درمیان آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ جذبی، اختر الایمان، خورشید الاسلام، جاں نثار اختر، مخدوم، کیفی اور سردار جعفری وغیرہ بلا تکلف بحثوں میں حصہ لیتے تھے۔ ہماری نشستوں کے انگنت ٹھکانے تھے، کافی ہاؤس، ٹی ہاؤس اور فلپاتھ پر بنی ریلنگ ہمارے میٹنگ Point ہوا کرتے تھے۔ آج وہ کیفیت ہے ہی نہیں اور ہو بھی کیسے کہ اب ادب کی جنوں سامانی کی جگہ ہوشمندی نے لے لی ہے۔ معاشرتی حالات نے وقت اور فرصتوں کی فراوانی کو بھی تنگی میں بدل دیا ہے۔ جہاں تک ہندی کے ادبی منظر نامے کا تعلق ہے وہ مجھے آج بھی زیادہ سرگرم، روشن اور جنوں ساماں نظر آتا ہے۔ لوگ اپنا ادب پڑھتے ہیں۔ اور عالمی ادب پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہندی کی سرحدیں پھیلتی جا رہی ہیں۔ ہندی والوں میں معاصر ادب سے باخبری کمال کی ہے۔ ہندی کے ادبی رسالوں میں اپنے یُگ کا احساس دلانے والی تحریریں کافی ہوتی ہیں۔ پہاڑی اور دیہی علاقوں کے ساتھ ساتھ قومی دھارے سے جڑی ہوئی زندگی کی کہانیاں بھی بے شمار شائع ہوتی ہیں۔ مجھے بعض ہندی ادیبوں کی یہ ادا بھی اچھی لگتی ہے کہ وہ معاصر ہندوستانی زندگی سے بھرپور معانقہ کرنے کے خیال سے مختلف علاقوں میں کچھ دنوں کی بود و باش کے لیے نکل جاتے ہیں۔ باسی موضوعات پر لکھنے کا رویّہ ہندی کے بیشتر ادیب بالکل چھوڑ چکے ہیں۔ اس صورتِ حال کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ ہندی میں پبلشروں کی ایک لمبی قطار موجود ہے جو ہندی بیلٹ میں دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ میرے خیال میں اردو ہندی کے ادبی منظر ناموں کا تقابل اردو کو اور زیادہ حقیر فقیر بنا دے گا۔

س: یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ کے یہ جملے مہمیز کا کام کریں اور اردو والوں کی نئی نسل کھوئی ہوئی قوت نیز فراموش کی ہوئی روایات کو پھر سے حاصل کر لے۔

ج: خدا کرے ایسا ہو۔

س: آپ کے رسالے ''ذہنِ جدید'' میں ادب کے ساتھ ساتھ مصوری، موسیقی، رقص، فلم، تھیٹر، کارٹون، فوٹو گرافی، ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادب اور مغربی ادبی سرگرمیوں کا تعارف اور بے لاگ مباحثے بھی ہوتے ہیں۔ یقیناً یہ اردو کے دوسرے رسائل سے مختلف ہے۔ ایسا رسالہ شائع کرنے کا ارادہ آپ نے کب کیا، اور یہ کیسے ممکن ہو سکا؟

ج: شہپر صاحب! میں نے اپنی زندگی کے ہر اہم دوراہے پر اس راہ کو اختیار کرنا پسند کیا جس کے آس پاس کچھ نیا نیا سا نظر آنے کی امید ہو۔ شاعری اور کل وقتی ملازمت میں بھی وہی کیا جو مری دانست میں پہلے نہ ہوا تھا۔ ''ذہنِ جدید فورم'' تو ایک ادبی تنظیم کی شکل میں پہلے ہی وجود میں آ چکا تھا اس کی ادبی نشستیں بھی دہلی میں وقتاً فوقتاً ہوا کرتی تھیں۔ ''ذہنِ جدید'' کو ایک سہ ماہی رسالے کی شکل دینے کا کام ستمبر 1990 میں ہوا۔ ''ذہنِ جدید'' اپنے صفحات پر اور اپنے مزاج و معیار کے اعتبار سے کیسا ہو اس کا خیال مجھے ریڈیو پر رہ کر ہوا۔ جہاں تنوع اور رنگارنگی ہی نشریات کا حق تھا، دوسرے ریڈیو اور براڈ کاسٹنگ میں ادب کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ کا Coverage بھی ہوتا تھا۔ اس کے لیے یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ جو بھی اس وادیِ پُر خار کا مسافر بننے کا آرزومند ہو وہ نہ صرف ساؤنڈ میڈیم کا نبض آشنا ہو بلکہ ہندوستانی فنونِ لطیفہ کے خد و خال کو بھی پہچانتا ہو۔ اس کے تعارف اور تجزیے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ بس اس خیال کے تحت میں نے ''ذہنِ جدید'' کے منفرد خد و خال کا تعین کیا اور اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا تاکہ میرے رسالے کا نوجوان قاری اگر چاہے تو ساؤنڈ میڈیا کی دنیا کا حصہ بھی بن سکے۔ اس کے ساتھ ہی یہ احساس بھی تھا کہ اردو کی ادبی صحافت کو ایک ایسا چہرہ دیا جائے جو قومی ثقافت کے نقش و نگار سے آراستہ ہو اور اپنی مثال آپ ہو۔ یہ کام بظاہر مشکل تھا خاص طور سے اس لیے بھی کہ اس کے لیے وسائل اور مالیات کی کوئی ضمانت نہ تھی مگر نیت کا خلوص اور ارادے کا استحکام کام آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ''ذہنِ جدید'' جیسا رسالہ شائع کرنے کا کام کسی ادارے کا تھا لیکن یہ میرے جیسے تنہا فرد نے بے سروسامانی میں انجام دیا۔ یا یوں کہیے:

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اس لگن اور کاوشِ مسلسل نے ''ذہنِ جدید'' کے اشاعتی تسلسل کے 52 ویں شمارے تک پہنچا دیا، وہ بھی اس طرح کہ عصری ادب اور فنونِ لطیفہ کے آمیزے سے ترتیب پانے والے رسالے کو ایک مکمل جریدے کی شکل میں پڑھنے والوں کے مطالعے کا حصہ بنا دیا۔ شہپر صاحب! میں نے پچاس برسوں کی ادبی زندگی میں اس قدر ذوق اور آمادگی کے ساتھ کسی ادبی رسالے کو اردو قارئین کے ایک بڑے اور قابلِ ذکر حلقے میں اپنی مثالی جگہ بناتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میرے اعتماد نے مجھے لڑکھڑانے نہیں دیا۔ آج خلقِ خدا یہ کہہ رہی ہے کہ ''ذہنِ جدید'' اردو کا اعلیٰ معیار کا متنوع اور قومی شناخت رکھنے والا ہمہ پہلو رسالہ ہے۔ مجھے محنت کرنے کی عادت ہے اور کسی قدر منظم ہو کے کام کرنے کا مزاج بھی ہے نیز تربیت بھی اسی طرح کی ہوئی ہے، اس لیے مجھے ''ذہنِ

جدید'' کے معیار و مزاج اور اس کے متنوع کو بنائے رکھنے میں کوئی بڑی مشکل پیش نہیں آئی۔ ادب کے علاوہ میں ہندوستانی فنونِ لطیفہ پر سیر حاصل اور خصوصی نوعیت کے مضامین شائع کرنے والے انگریزی رسائل اور کتابیں باقاعدگی کے ساتھ پڑھتا ہوں اور ہر ممکن کوشش کرتا ہوں کہ تھیٹر، فلم، رقص، پینٹنگ اور موسیقی کے پروگراموں میں شرکت کروں اور پھر ان سے متعلق ''ذہنِ جدید'' میں کچھ لکھوں۔ میرے خیال میں ان تمام مساعی اور ذوق و شغف نے ''ذہنِ جدید'' کو بڑی زبان کا زندہ رسالہ بنادیا ہے۔

س: اب ایک آخری سوال زبیر صاحب! یہ فرمایئے کہ کیا نئی نسل اور نئے ادب سے اردو کے بعض ناقدین کی طرح آپ بھی مایوس ہیں؟ یا.........!

ج: جب ہم لوگ لکھ رہے تھے تو ابتدا میں ہمارا بھی یہ تاثر تھا کہ ترقی پسندوں کی پہلی صف ہماری تخلیقی کاوشوں سے ناواقف ہے، مگر یہ ادھوری حقیقت تھی۔ میں اپنے بعد کی نسل کی تخلیقی سرگرمیوں کو سنجیدگی سے دیکھتا ہوں۔ ان سے باخبر رہتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ نئی نسل کی بہترین صلاحیتوں کو ''ذہنِ جدید'' کے ذریعے منظرِ عام پر لاؤں۔ اس ضمن میں بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں، نام لیے جاسکتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ آج اردو دنیا کی مختلف سرگرمیوں میں نئے لوگ خاص لگن کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں اور اپنی جگہ بنارہے ہیں۔ اس ارتقائی منظرنامے سے انکار ممکن نہیں۔ ادبی تاریخ ہر دور میں اپنے عصری تخلیقی منظروں سے جانی اور پہچانی گئی ہے۔ اس لیے ہر دور کی ادبی تاریخ کو اس دور کے ادبی، ثقافتی اور عمرانی تناظر میں رکھ کر مرتب کرنا ہوگا۔ ہر نیا ادبی عہد اپنی شناخت کے لیے ادبی قد وقامت نیز چہرے مہرے ساتھ لاتا ہے اس لیے یہ سوال قائم کرنا کہ میر، غالب اور اقبال کے بعد ان جیسے شاعر پیدا نہیں ہوئے یا فیض، راشد، قاسمی، اختر الایمان اور عزیز حامد مدنی جیسے شاعر جدیدیت کے شعری رجحان کے زیرِ اثر کیوں پیدا نہیں ہوئے۔ اور چونکہ نہیں پیدا ہوئے اس لیے پہلے کے مقابلے میں بعد کا ہر دور کم مایہ اور کم پایہ دور کہا جائے گا، سراسر سطحی اور بے معنی سوچ ہے جس پر ایک لمبا ساخطِ تنسیخ ہی کھینچا جاسکتا ہے۔

● بہت بہت شکریہ زبیر صاحب، آپ نے صرف میرے سوالات کے بھرپور جواب دینے کی زحمت کی بلکہ نہایت اہم اور تفصیلی گفتگو فرمائی جو ادب سے اور اس کے متعلقات سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یقیناً دلچسپی اور معلومات کا سامان بہم پہنچائے گی۔

□□□

پتہ:
Department of Urdu, Jamia Millia Islamia,
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-110025

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: ڈاکٹر سیّدہ جعفر

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار محمد قلی قطب شاہ بہ یک وقت کئی اوصاف سے متصف تھا۔ اس کا ایک اہم وصف شعر گوئی بھی تھا۔
یہ اس کی مستند کلیات ہے جس میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی شامل ہے۔

صفحات: 824، قیمت -/157 روپے

کلیاتِ سراج

مرتب: عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی اردو کے کلاسیکل شاعروں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔
دیباچے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات اور ان کے شخصی اوصاف کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن) **صفحات: 732، قیمت -/138 روپے**

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجرانِ کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔
قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

خلیل الرحمٰن اعظمی

(ہماری مطبوعات سے)

خواجہ میر درد: عشقیہ شاعری کے آئینے میں

خواجہ میر درد اردو کے ان قابل احترام شاعروں میں ہیں جن کا کلام شائستگی و نفاست، کیف و اثر اور فنی رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے ایک معیاری چیز ہے۔ اردو کے عام شعرا کے برخلاف وہ ایک پیشہ ور شاعر نہیں تھے۔ ان کا سرمایۂ شعری بہت مختصر اور منتخب ہے۔ انشا، مصحفی، جرأت اور شاہ نصیر کی طرح ان کے مجموعۂ کلام میں طویل غزل یا دو غزلے اور سہ غزلے نہیں ملیں گے۔ استادی اور کرتب دکھانے کے لیے انھوں نے سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کرنے یا الف سے لے کر 'ی' تک تمام ردیفوں میں غزلیں کہنے کا التزام کبھی نہیں کیا۔ ان کے لب و لہجے میں میر کی سادگی اور گھلاوٹ ہے۔ لیکن ان کی شخصیت میں میر کی نسبت اعتدال اور توازن ہے۔ میر کے یہاں شکست خوردگی اور غموں کی شدید جلن ہے، ان کی آواز میں کبھی کبھی تھکن آجاتی ہے لیکن خواجہ میر درد نے غموں کو ہضم کر کے اسے گوارا بنا لیا تھا اسی لیے ان کے یہاں ایک حسین سی کسک ہے جو ہم پر خوش گوار اثر چھوڑتی ہے۔ تصوف نے ان کے مزاج میں ترتیب و تہذیب پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے وہ ان شاعرانہ بے اعتدالیوں سے بچ گئے جو میر کی کلیات کو ناہموار بنا دیتی ہیں اور جن کی بنا پر ''بلندش بغایت بلند اور پستش بغایت پست'' کا فقرہ ان کے لیے وضع کیا گیا۔

اپنی صوفیانہ شاعری کے علاوہ خواجہ میر درد اپنی عشقیہ شاعری میں بھی اردو کے غزل گو شعرا میں منفرد ہیں۔ ان کی اس حیثیت میں سوائے میر کے ان کا اور کوئی حریف نہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عشقیہ شاعری کے سلسلے میں ان کا تذکرہ کبھی نہیں آتا۔ جن شعرا نے عشق و محبت کے صرف مضمون باندھے ہیں ان کے اشعار کو طرح طرح کے معنی پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن جس شاعر کے عشقیہ اشعار تاثیر سے لبریز ہیں ان پر کسی کی نگاہ نہیں جاتی۔ اردو کے عام غزل گو شعرا کے یہاں عشق و محبت کے مضامین بھرے پڑے ہیں لیکن ان کی حیثیت محض لطفِ بیان کی ہے۔ سچی چاہت اور اس کا کرب اور عشق کی شدید کیفیات سے ان کے اشعار خالی ہیں اس لیے قدیم تذکروں میں ان کے موضوع کو چھوڑ کر ان کے طرز بیان اور فنی خوبیوں کو مختصراً زیر بحث لایا گیا ہے۔

بعد میں جب ہمارے تذکرہ نگار و مورخ تفصیلات میں جانے لگے تو ہر شاعر کے ساتھ بعض باتیں منسوب کر دی گئیں۔ مثلاً میر، درد و غم کے شاعر ہیں اور خواجہ میر درد تصوف و عرفان کے۔ یہ روایت کچھ ایسی چلی کہ آنے والے لوگوں نے بھی اکثر و بیشتر انھی بیانات کو جوں کا توں اپنا لیا ہے۔ محمد حسین آزاد ''آبِ حیات'' میں خواجہ میر درد کے تغزل کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''انھوں نے میر کی غزلوں پر جو غزلیں لکھی ہیں وہ میر سے کسی طرح کم نہیں ہیں اور چھوٹی بحروں میں انھوں نے جو غزلیں لکھی ہیں ان میں تلوار کی آبداری اور نشتریت ہے۔'' لیکن ان کے عاشقانہ موضوعات کا ذکر نہیں کرتے بلکہ ان کے تصوف پر زور دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ''تصوف جیسا انھوں نے کہا اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔'' دور حاضر کے تاریخ نگار بھی اس حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ موجودہ زمانے کی دو مقبول عام تاریخوں میں خواجہ میر درد کے بارے میں یہی تصور ملتا ہے۔

رام بابو سکسینہ ''تاریخ ادب اردو'' میں لکھتے ہیں:

''خواجہ میر درد کے یہاں ہر شعر میں معشوق سے مراد معشوق حقیقی یا مرشد ہے۔''

ڈاکٹر اعجاز حسین نے طالب علموں کے لیے ''مختصر تاریخ ادب اردو'' لکھی ہے۔ اس میں فرماتے ہیں:

''میر درد کی ایک یہ بھی خوبی قابل غور ہے کہ ان کے یہاں عشق حقیقی کا جلوہ ایسا غالب ہے کہ مجازی عشق کو کہیں جگہ نہیں ملتی۔''

اس مروجہ تنقید کا یہ نتیجہ ہے کہ جب ہم عشقیہ شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو خواجہ میر درد کو خالص صوفی شاعر سمجھ کر ان سے قطع نظر کر لیتے ہیں اور عشقیہ شاعری میں ان شعرا کے کارناموں کو شامل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کا کلام دیکھنے میں تو حسن و عشق ہی سے متعلق ہے لیکن تخیلی اور مثالی عشق کے سوا اس میں سچے عشق کی کیفیات نہیں ہیں۔ شاہ حاتم، آبرو، تاجی وغیرہ کو تو چھوڑیے کہ یہ لوگ صنعت گر تھے۔ لیکن ولی کے یہاں بھی عشق محض خیالی ہے

فکروفن (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) سے ماخوذ، / صفحات 205، قیمت : -/151 روپئے

نوٹ : قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے طلبہ اور اساتذہ کے لیے بالترتیب %45 اور %40 کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ہے۔

وہ زیادہ سے زیادہ ایک حسن پرست ہیں اسی لیے ان کے یہاں ہزاروں محبوب رنگ رنگ سے اپنی جھلک دکھلاتے ہیں۔ ولی کو ان سے کبھی واسطہ نہیں پڑا ہے۔ انھوں نے ان کو دور ہی سے دیکھا ہے: ظاہر ہے کہ دور سے دیکھنے والا وہ جذبات کہاں سے لاسکتا ہے جو محبوب کو پانے اور کھو دینے کے تجربے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

خواجہ میر درد یقیناً ایک صاحب عرفان بزرگ تھے اور تصوف کو ان کی زندگی میں مرکزیت حاصل تھی لیکن ان کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں دنیاوی اور مادی عشق کے تجربات کو بھی جگہ حاصل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے کلام میں ''غزلیت'' کے عناصر اس درجہ نہ ہوتے کہ امیر مینائی کو'' پسی ہوئی بجلیوں'' کا گمان ہوتا۔ خواجہ میر درد کے کلام کو مروجہ تنقیدی بیانات سے علاحدہ ہو کر اگر براہ راست پڑھا جائے اور غور وخوض سے کام لیا جائے تو ان کے کلام کا ایک بہت بڑا حصہ ایسا ملے گا جس کا تصوف ومعرفت یا توکل وفنا کے مسائل سے تعلق نہیں اور نہ ہی محبوب حقیقی یا مرشد کی محبت کا جلوہ ہے۔ اس پر کسی مٹی کی بنی ہوئی مورت کی پرچھائیاں معلوم ہوتی ہیں۔ ان مٹی کی بنی ہوئی مورتوں سے صوفی میر درد کو واسطہ پڑا تھا یا نہیں اس کے بارے میں کوئی یقینی بات نہیں کہی جاسکتی اور نہ ہی میں کوئی ایسا دعویٰ کرسکتا ہوں جو قابل تردید ہو لیکن ان کے کلام کی تہوں کو کھولنے اور ان کے محسوسات کا تجزیہ کرنے سے یقیناً ان میں اس عنصر کی کارفرمائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کا پتہ چلائیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ میر درد کو خانقاہ کے علاوہ دنیاوی زندگی اور اس کے کاروبار سے کچھ تعلق رہا ہے۔

خواجہ میر درد کے معاصر مصحفی ''تذکرۂ ہندی'' میں لکھتے ہیں:

''خواجہ میر درد در عہد فردوس آرام گاہ سپاہی پیشہ بود، آخر آخر ترک روزگار کردہ درویشی نشستہ۔''

دوسرا بیان دیوان خواجہ میر درد مطبوعہ نظامی پریس بدایوں کے مقدمہ نگار مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی لکھتے ہیں:

''ابتدائے شباب میں دنیادار رہے، جاگیر اور معاش کے اہتمام میں پوری تگ ودو کی۔ امرائے شاہی اور مقربان بارگاہ کے ناز اٹھائے۔ اٹھائیس برس کی عمر میں جذبۂ حق نے اپنی طرف کھینچا تو سب چھوڑ کر ادھر جھکے۔ لباس درویشی پہن کر آستانۂ جاناں پر سر جھکا دیا۔ انتالیس برس کی عمر میں خواجہ عندلیب صاحب کی رحلت کے بعد مسند نشین ارشاد ہوئے۔''

کیا اٹھائیس سال کی اس زندگی میں جو'' دنیاداری'' میں گزری اور وہ بھی عہد شباب، اس میں میر درد جیسی شاعرانہ طبیعت رکھنے والے شخص کی سوانح عمری بالکل سادہ ہوگی۔ ان کے رچے ہوئے جمالیاتی ذوق اور پرخلوص انسان دوستی نے کیا کبھی اس کا موقع نہ دیا ہوگا کہ وہ اپنے سینے میں کوئی دھڑکن محسوس کرسکیں اور کسی کو اپنانے کا کوئی جذبہ پیدا ہو۔ اگر وہ اتنے ہی کھردرے، سپاٹ اور لطیف کیفیات سے خالی انسان ہوتے اور جاگیر ومعاش کو محض جاگیرداروں کی طرح برتتے تو میرا خیال ہے وہ عمر کی کسی منزل میں صوفی بھی نہیں ہوسکتے تھے۔ بغیر تاثراتی ذہن اور گداختگی کے کوئی شخص تصوف کی طرف مائل ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر اگر ان کا صوفی اور وہ بھی حقیقی صوفی ہونا صحیح ہے اور ان کی غزلوں کی تاثیر اور گھلاوٹ بھی مسلم ہو تو ہم کیوں نہ ان کے عہد شباب کے تجربات کو بھی ان کی شخصیت کو بنانے میں ایک اہم حیثیت دیں۔ اگر خواجہ میر درد کی جوانی عشق کے لطیف کیفیت سے منسوب کردی جائے تو اس سے ان کی شخصیت پر کوئی داغ آنے کے بجائے یہ ایک فطری عمل ہوگا اور اس سے ان کی بزرگی یا تقدس پر کوئی حرف نہ آئے گا۔ ذرا ان اشعار کو پڑھیے اور دیکھیے کہ اس میں محبوب روحانی ہے یا مادی:

تو بن کہے گھر سے کل گیا تھا
اپنا بھی تو جی نکل گیا تھا
اب دل کو سنبھالنا ہے مشکل
اگلے دنوں کچھ سنبھل گیا تھا
آنسو جو مرے انھوں نے پونچھے
کل دیکھ رقیب جل گیا تھا
شب تک جو ہوا تھا وہ ملائم
اپنا بھی تو جی پگھل گیا تھا
اگر مجھ سے ملیے کبھو عیب کیا ہے
نہ بد وضع ہے تو نہ بدکار ہوں میں
پھرتے ہو کج بنائے تم اپنی جدھر تدھر
لگ جاوے دیکھیو نہ کسی کی نظر کہیں
دل کو لے جاتی ہیں معشوقوں کی خوش اسلوبیاں
ورنہ ہیں معلوم ہم کو سب انھوں کی خوبیاں
صورتوں میں خوب ہوں گی شیخ گو حور بہشت
پر کہاں یہ شوخیاں، یہ طور یہ محبوبیاں
زلفوں میں تو سدا سے یہ کج ادائیاں ہیں
آنکھوں نے پر اب اور ہی آنکھیں دکھائیاں ہیں
کہیں ہوئے ہیں سوال و جواب آنکھوں میں
یہ بے سبب نہیں ہم سے حجاب آنکھوں میں
کیا کہوں تجھ سے ہم نشیں دل میں
برچھی سی لگتی ہے وہ ترچھی نگاہ

شوخ تو اور بھی ہیں دنیا میں
پر تری شوخی کچھ عجب ہے واہ

جوں جوں وہ کٹے ہے تو یہی آتی ہے جی میں
پھر چھیڑیے اور باتیں کیا کیجیے اس سے

ترچھی نظروں سے دیکھنا ہر دم
یہ بھی اک بانکپن کا بانا ہے

دل تجھے کیوں ہے بے کلی ایسی
کون دیکھی ہے اچپلی ایسی

خون ہوتا ہے دل کا یاں آ کر
مہندی پاؤں میں کیا ملی ایسی

دل بھلا ایسے کو اے درد نہ دیجیے کیونکر
ایک تو یار ہے اور اس پہ طرحدار بھی ہے

اس ''یار طرحدار'' کو رام کرنے کے لیے میر درد کو وہی سارے جتن کرنے پڑے جو دنیاوی عاشق کیا کرتے ہیں اور محبوب اپنی سماجی حیثیت کے مطابق انھی شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے جو ''عہد میر'' کے محبوب کا خاصہ تھا۔ خواجہ میر درد کو بھی چاہت کا یہ کھیل کھیلنا پڑا ہے اور ان پر ایک عجیب کش مکش کا عالم طاری رہا:

جو اس طرح غیروں سے ملتا پھرے ہے
کبھو تو ہمارا بھی وہ آشنا تھا

بلائیں جو کچھ اس کے ملنے سے دیکھیں
نہ ملتے تو اے درد اس سے بھلا تھا

یوں وعدے ترے دل کو تسلی نہیں دیتے
تسکین بھی ہووے گی جب آن ملے گا

گر ہیں یہی ڈھنگ تیرے ظالم
دیکھیں گے کوئی وفا کرے گا

کوئی مزاج داں نہ ہوا آج تک مگر
اک اس کے خوئے تند سے ملتی ہے خوئے تیغ

ظالم جفا جو چاہے سو کر مجھ پہ تو ولے
پچھتاوے پھر تو آپ ہی ایسا نہ کر کہیں

بعد مرنے کے مرے ہوگی مرے رونے کی قدر
تب کہا کیجیے گا لوگوں سے وہ برساتیں کہاں

سعی بے جا مت کرو مہر و وفا وہ شوخ تو
جی کو ان باتوں سے ہرگز آشنا کرتا نہیں

وعدے تو مرے ساتھ کیے تو نے ہزاروں
پر ایک بھی انتوں میں سرانجام کہیں ہو

دل نالاں کو یاد کر کے صبا
اتنا کہنا جہاں وہ قاتل ہو

نیم بسمل کوئی کسو کو چھوڑ
اس طرح بیٹھتا ہے غافل ہو

اوروں سے تو ہنستے ہو نظروں سے ملا نظریں
ادھر کو نظر کوئی پھینکی بھی تو زیر دیدہ

سناؤں کیونکر اپنا حال میں کیا سخت مشکل ہے
یہ قصہ جب لگوں کہنے تو اس کو نیند آتی ہے

تمھارے وعدے بتاں خوب میں سمجھتا ہوں
رہا ہے ایسے ہی لوگوں سے کاروبار مجھے

اپنے دروازے تلک بھی وہ نہ آیا ایک بار
ہر گھڑی اٹھ اٹھ کے ہم جس کے لیے جایا کیے

کبھو تو بے وفائی یاد آ جی کو ڈراتی ہے
کبھو امید وعدوں کے بھروسے یاں دلاتی ہے

غیر کچھ کچھ کان میں بھی دم بدم کہنے لگے
بات اب تم اپنے دل کی ہم سے کم کہنے لگے

کہہ بیٹھو نہ درد کہ اہل وفا ہوں میں
اس بے وفا کے آگے جو ذکر وفا چلے

اے درد غیر کا نہیں شکوہ مرے تئیں
جو کچھ گلہ ہے مجھ کو سو ہے اپنے یار سے

مدت ہوئی کہ ویسی عنایات رہ گئی
اب گاہ گاہ سیدھی ملاقات رہ گئی

یاں کون آشنا ہے ترا کس کو تجھ سے ربط
کہنے کو یہ بھی لوگوں کے اک بات رہ گئی

جس دل پہ بے وفائی معشوق کے سبب
یہ کچھ گزر چکا ہو وہ پھر چاہ کیا کرے

دل دے چکا ہوں اس بت کافر کے ہاتھ میں
اب میرے حق میں دیکھیے اللہ کیا کرے

مندرجہ بالا اشعار کا اگر بغور مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے تو اس بات میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ خواجہ میر درد کو جاگیر و معاش کے علاوہ اپنے ایام شباب میں تھوڑی بہت تگ و دو محبوبان مجازی کے کوچے میں بھی کرنی پڑی ہے۔ افسوس ہے کہ تحقیقی وسائل کی کمی کی وجہ سے یہ بتانا مشکل ہے کہ ان اشعار کا سن تصنیف کیا ہے لیکن ان کے معانی و مفاہیم سے کچھ نہ کچھ نتائج نکالے جاسکتے ہیں۔

خواجہ میر درد کی شاعری کا عاشق اپنے مزاج کے اعتبار سے میر کی شاعری کے عاشق سے بہت ملتا جلتا ہے۔ دونوں کے یہاں دھما چوکڑی اور کشتم کشتا کے بجائے سپردگی اور گداختگی ملتی ہے۔ دونوں آہستہ آہستہ سلگتے ہیں۔ یکا یک بھڑک نہیں اٹھتے۔ دونوں محبوب کی بے وفائیوں سے پیار کرتے ہیں۔ ایک مدت تک اپنے دل کو بہلاتے پھسلاتے رہتے ہیں۔ تغافل کا جواز بھی ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ محبوب سے شکوہ شکایت کرنے میں ڈانٹتے پھٹکارتے نہیں، دھمکی یا چیلنج نہیں دیتے نرم اور مانوس لہجے میں کچھ سرگوشی اور چمکارنے کے انداز میں باتیں کرتے ہیں:

سو بار دیکھیں میں نے تری بے وفائیاں
تس پر بھی نت غرور ہے دل میں نباہ کا

اپنے ملنے سے منع مت کر
اس میں بے اختیار ہیں ہم

تو مجھ سے غبار رکھ نہ جی میں
آوے بھی اگر ہزار جی میں

بیزار ہے مجھ سے تو یہ مجھ کو
اب تک تو وہی ہے پیار جی میں

بے وفائی پہ اس کی دل مت جا
ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں

ہے اپنے جی میں جو کچھ تم جانو یا نہ جانو
پر سب تمھاری باتیں اب ہم نے پائیاں ہیں

ہر چند نہیں صبر تجھے درد و لیکن
اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

میں نہیں کہتا کہیں تم اور مت جایا کرو
بندہ پرور اس طرف کو بھی کبھو آیا کرو

کیا جگر کو مرے داغ تیرے وعدوں نے
خبر سنی جو کہیں میں کسو کے آنے کی

نظر نہ کیجیو تو مرے دل کے خطروں پر
نہ جی میں لائیو کچھ، بات کیا دوانے کی

طریق ذکر تو ہے درد یاد عالم کو
طرح بتاؤ کچھ اپنے تئیں بھلانے کو

ٹک خبر لے کے ہر گھڑی ہم کو
اب جدائی بہت ستاتی ہے

درد اس کی بھی دید کر لیجیے
نوجوانی یہ مفت جاتی ہے

جی کی جی ہی میں رہے بات نہ ہونے پائی
ایک بھی اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

جی فنا ہو ہی گیا اک نگہ گرم کے ساتھ
درد کچھ اور عنایات نہ ہونے پائی

نہ ملیں گے اگر کہے گا تو
تیری خاطر ہمیں مقدم ہے

درد کے آنے کو اے یار برا کیوں مانا
اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

یارو مرا شکوہ ہی بھلا کیجیے اس سے
مذکور کسی طرح تو جا کیجیے اس سے

سو مرتبہ یوں ٹھہر چکی اس سے نہ ملیے
وہ بھی تو نہیں بنتی ہے کیا کیجیے اس سے

گر چاہیے تو ملیے اور چاہیے نہ ملیے
سب تم سے ہو سکے ہے ممکن نہیں تو ہم سے

دشنام دے ہے غیر کو تو جان کر مجھے
پیارے یہ لطف کیجیے پہچان کر مجھے

کل کی طرح سے آج بھی اب نیند آچکی
گھیرا اسی خرابی نے پھر آن کر مجھے

کبھو تو بے وفائی یاد آ جی کو ڈراتی ہے
کبھو امید وعدوں کے بھروسے یاں دلاتی ہے

چھلاوا سا جو ہو جاتا ہے جلوہ وصل کا کا ہے
جدائی پھر تو اک مدت عوض کیا کیا دکھاتی ہے

وصل سے بھی تو سیری ہوتی ہے
کہیں اس بات کا ٹھکانا ہے

دل لگاؤ کہ یا گلے ہی لگو
داؤ ہے لگیے جو لگانا ہے

دل تڑپتا ہے درد پہلو ہے
جی نکل جائے کہ قابو ہے

غم سے پہچانتا نہیں ہوں میں
کہ مرا سر ہے یا کہ زانو ہے

عہد شکن ہو خواہ وہ دل شکن کیا کرے
اس کی طرف سے ہو سو ہو آپ نباہ کیجیے

یوں تو ہے دن رات میرے دل میں اس کا ہی خیال
جن دنوں اپنی بغل میں تھا سو وہ راتیں کہاں

شام بھی ہوچکی کہیں اب تو
آ شتابی کہ رات جاتی ہے
دن تمھارے تو کٹے بارے خوشی سے ہر طرح
ہم بلا سے یاں پڑے راتوں کو گھبرایا کیے
کون سی رات آن ملیے گا
دن بہت انتظار میں گزرے

اشعار کا یہ سرسری انتخاب پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ یہ سپردگی و محویت، سنبھلی ہوئی کیفیت، یہ ضبط و توازن، یہ نرم اور پرخلوص لہجہ اور یہ غم کو برداشت کرنے کی صلاحیت جس نے خواجہ میر درد کے اشعار میں بے پناہ اثر اور نشتریت پیدا کردی ہے وہ اردو کی عشقیہ شاعری کو اس مقام پر لے جاتی ہے جہاں صرف میر تقی میر ہی پہنچ سکتے ہیں۔ خواجہ میر درد کی شاعری کا یہ پہلوان کی صوفیانہ شاعری سے کم اہم نہیں ہے۔ رکاکت و ابتذال اور پھکڑ پن سے ہٹ کر پرخلوص عشقیہ شاعری جو غزل کی لطافتوں سے بھرپور ہو چند گنے چنے شاعروں کے یہاں ملتی ہے۔ خواجہ میر درد کی عشقیہ شاعری کے اس سرمائے کو اس کے ساتھ شامل کر دینے سے ہماری عشقیہ شاعری کا وزن اور قدر و قیمت بڑھ جائے گی۔

□□□

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے ایل نیل کنٹھ شاستری/ مترجم: آر کے بھٹناگر

جنوبی ہند کی تاریخ پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کتاب میں جنوبی ہند کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصفِ اوّل تک کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 576، قیمت -/114 روپے

دکنی نثر کا انتخاب

مرتبہ: سیّدہ جعفر

دکنی نثر کا یہ انتخاب دکن میں اردو نثر کی ابتدا سے فورٹ سینٹ جارج کالج کے زمانے تک کے مصنفین کا احاطہ کرتا ہے اور ان کی تصانیف کے نمائندہ منتخبات پر مشتمل ہے۔

صفحات: 168، قیمت -/45 روپے

سخنورانِ گجرات

مرتب: سیّد ظہیرالدین مدنی

گجرات میں اردو شعر و ادب کی نشاندہی پندرھویں صدی کے نصف آخر سے کی جاتی ہے۔

اس کتاب میں ابتدا سے 1950 تک کے شعرا کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تبصرہ، سیاسی اور سماجی پس منظر کے ساتھ درج ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)

صفحات: 340، قیمت -/77 روپے

نوٹ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دھلی کی جانب سے طلبه اور اساتذہ کے لیے بالترتیب 45% اور 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ھے۔ تاجران کتب کو قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق رعایت دستیاب ھے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

اردو خبرنامہ

اردو ایک زندہ زبان ہے — نائب صدر جمہوریہ

● نئی دہلی۔ 18 جون، نائب صدر جمہوریہ محمد حامد انصاری نے کہا ہے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے، اسے آثار قدیمہ میں شامل نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہاں آندھرا پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین محمد رحیم الدین انصاری کی قیادت میں ایک سہ رکنی وفد سے ملاقات کے دوران انھوں نے ملک میں اردو کی موجودہ صورت حال پر تفصیلی تبادلۂ خیال کیا۔ نائب صدر نے اس موقع پر آندھرا پردیش اردو اکادمی کو مرقعِ چغتائی (دیوان غالب مصور) کی اشاعت نو پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس کے اجرا کی درخواست قبول کی، جو آئندہ ماہ حیدرآباد میں نائب صدر جمہوریہ اور ریاستی وزیراعلیٰ راج شیکھر ریڈی کی موجودگی میں عمل میں آئے گا۔ نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ اردو والوں کو اپنا آئینی حق ضرور طلب کرنا چاہیے اور سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کی تعلیم پر زور دینا چاہیے۔ انھوں نے اتر پردیش میں اردو کے گرتے ہوئے معیار پر افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے بعد صورتحال اطمینان بخش ہے۔ اس موقع پر آندھرا پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین محمد رحیم الدین انصاری نے نائب صدر جمہوریہ کو بتایا کہ آندھرا پردیش اردو اکادمی کا سالانہ بجٹ 36 کروڑ 40 لاکھ روپئے ہے اور اردو میڈیم کے چار لاکھ طلبہ میں 23 کروڑ روپئے کے وظیفے تقسیم کیے گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آندھرا پردیش اردو اکادمی کا بجٹ ملک کی تمام اکادمیوں کے مجموعی بجٹ سے زیادہ ہے۔ اس پر نائب صدر جمہوریہ نے آندھرا حکومت کی ستائش کی۔

(ہمارا سماج، دہلی)

اردو کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کی جائیں گی: کپل سبل

● نئی دہلی۔ 25 جون، اردو کے فروغ کے لیے سہ لسانی فارمولے کو اس کی صحیح شکل میں نافذ کرنے اور اردو میڈیم اسکولوں کی جدید کاری کی یقین دہانی کے ساتھ آج یہاں فروغ انسانی وسائل کے وزیر کپل سبل نے قومی اردو کونسل کی اردو مطبوعات کی موبائل وین کو ہری جھنڈی دکھائی جس میں مختلف موضوعات پر ایک ہزار کتابیں نمائش اور فروخت کے لیے رکھی گئی تھیں۔ مسٹر کپل سبل نے اس موقع پر اپنے اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ اردو کی تعلیم کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کی جائیں گی جس کے لیے تعلیمی نظام کی تشکیل نو لازمی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد یونیورسٹی اور قومی اردو کونسل کے پروگراموں میں مزید وسعت لانے کی ضرورت ہے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ اردو ہماری گنگا جمنی تہذیب وثقافت کی پہچان اور ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی ہر مذہب کے ماننے والوں کی زبان ہے، قومی یکجہتی کو فروغ دینے میں اردو نے ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اردو والوں سے بھی اپیل کی کہ وہ اردو زبان کے تعلق سے اپنی ذمے داریاں بھی احسن طور پر نبھائیں اور تعلیم کے بدلتے منظرنامے سے خود کو وابستہ کریں۔ ان کی وزارت مسلم معاشرے کو جدید تکنیکی تعلیم سے آراستہ کرنے میں فعال کردار ادا کرے گی۔ اس موقع پر کونسل کے وائس چیئرمین چندر بھان خیال اور ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے بھی اظہار خیال کیا اور اردو زبان وادب کے حوالے سے امکانات کے نئے در کھولنے کی یقین دہانی کرائی۔ ڈاکٹر بھٹ نے اردو کتابوں کی فراہمی کے معاملے کو اہم قرار دیتے ہوئے کہا کہ اردو کی معیاری اور نصابی کتابیں ہر شہر اور قصبے میں دستیاب کرانے کے لیے کونسل کوشاں ہے۔ اردو مطبوعات کی موبائل وین کونسل کی انھی کوششوں کا ایک حصہ ہے۔ موبائل اولاً اتر پردیش کے ان شہروں میں جائے گی جہاں اردو آبادی قابلِ لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔ پھر دوسرے صوبوں کا دورہ بھی کرے گی۔ اس موقع پر جناب کپل سبل نے قومی اردو کونسل کے ماہانہ رسالے ''اردو دنیا'' کے تازہ شمارے کی رونمائی بھی کی جس کی ایک ایک کاپی موجود حضرات کو جن میں صحافیوں کے علاوہ دیگر اہلِ قلم بھی شامل تھے، ہدیتاً پیش کی گئی۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

نئی یونیورسٹیوں کا قیام جلد

● نئی دہلی۔ 4 جولائی، مرکزی وزیر برائے اقلیتی امور جناب سلمان خورشید نے کہا ہے کہ مرکزی حکومت بہت جلد علی گڑھ کے طرز پر مسلمانوں کے لیے تین نئی یونیورسٹیاں قائم کرے گی۔ ''راشٹریہ سہارا'' سے ایک خصوصی ملاقات میں سلمان خورشید نے کہا کہ مجوزہ یونیورسٹیاں کرناٹک، بہار اور راجستھان میں وہاں کے اوقاف کی کونسلوں اور وقف بورڈوں کی مدد سے قائم کی جائیں گی۔ فی الحال ان کی حکومت مختلف قانونی پہلوؤں کا جائزہ لے رہی ہے تاکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جو قانونی اڑچنیں پیدا

کی گئیں ہیں ویسی مشکلات ان یونیورسٹیوں کے قیام کے دوران پیدا نہ ہوں۔

سلمان خورشید نے کہا کہ اب مرکزی حکومت اقلیتی فرقے کے ایسے تمام طالب علموں کی فیس اور دیگر اخراجات کو مکمل طور پر برداشت کرنے کی اسکیم لا رہی ہے جو قومی سطح کے انسٹی ٹیوشن میں اپنی قابلیت کی بنیاد پر داخلہ پانے میں کامیاب ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی حکومت اقلیتوں کو مساوی مواقع دینے کے لیے جلد ہی ایکول رائٹس کمیشن قائم کرے گی۔ حکومت چاہتی ہے کہ اقلیتوں کے تحفظ میں اکثریت کی ساجھے داری ہو اور اکثریتی فرقہ اقلیت کی فلاح میں اہم کردار نبھائے۔ مسٹر سلمان نے کہا کہ مسلمانوں نے کانگریس کو بار بار اور بالخصوص اس الیکشن میں زبردست طاقت عطا کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کے مسلمان مرکزی سرکار پر یقین کریں ان کی فلاح اور ان کے آئینی حقوق کے تحفظ کے لیے یو پی اے کی حکومت پوری طرح پابند عہد ہے لیکن ہم کو سارے ملک کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ مسٹر خورشید نے کہا کہ مرکزی حکومت کی خواہش ہے کہ اقلیت کی ترقی میں اکثریت بھی ایک اہم کردار نبھائے۔ انھوں نے کہا کہ ان کی سرکار سچر کمیشن کی سفارشات کے معاملے میں بھی نہایت سنجیدہ ہے اور ان کے نفاذ کے معاملے میں صدق دلی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو موبائل وین کا اتر پردیش کے مختلف شہروں میں خیر مقدم

● قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی اردو کتابوں کی موبائل نمائش 30 جون کو دہلی سے سہارنپور پہنچی۔ مسلم گرلز کالج کے پاس کھڑی وین پر اردو کتابوں کے شائقین کی تعداد صبح سے دوپہر تک تو کم رہی، شام ہوتے ہی تعداد میں اضافہ دیکھا گیا۔ لوگ ادب، سماجیات، سیاسیات، تاریخ اور طب کی کتابوں میں دلچسپی لے رہے تھے۔ 8 جولائی کو کتابوں کی یہ موبائل نمائش میرٹھ شہر کے فیض عام انٹر کالج پہنچی۔ میرٹھ میں پرنسپل غلام محمد نے اس وین کا شاندار استقبال کیا۔ اردو کتابوں کی دستیابی بذریعہ موبائل نمائش کی اطلاع پا کر کالج کے طلبہ نے اس کا استقبال کیا۔ موبائل نمائش کے انچارج وی صدیق نے بتایا کہ کونسل کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ اردو زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے زیادہ سے زیادہ تعمیری اور مثبت اقدام اٹھائے جائیں، اسی کے مدِ نظر کونسل نے اپنی مطبوعات کو لوگوں کو ان کے ہی علاقوں میں فراہم کرنے کا منصوبہ بنایا جس کے لیے ایک موبائل نمائش کے ذریعے کونسل کی تمام مطبوعات کی نمائش اور فروخت کا اہتمام کیا گیا۔ میرٹھ سینٹر کے انچارج ضیاء الرحمٰن عزیز نے بتایا کہ میرٹھ کے بعد وین امروہہ، مرادآباد، رامپور، بریلی، بدایوں، شاہجہاں پور اور دیگر شہروں میں بھی جائے گی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی موبائل نمائش کے سنبھل شہر پہنچنے پر اردو حلقے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ محبان اردو کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ قومی اردو کونسل کی موبائل نمائش سنبھل پہنچنے والی ہے اسے دیکھنے کے لیے لوگ امڈ پڑے جبکہ الترین آئی ٹی آئی اور کائنات انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ذریعے مشترکہ طور پر اس کا استقبال کیا گیا۔ دہلی سے آئی موبائل نمائش کے انچارج وی صدیق نے اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل کی موبائل نمائش کا مقصد محبان اردو کے پاس گھر گھر جا کر مناسب داموں پر اردو کی کتابیں فراہم کرانا ہے۔ اس موقع پر الترین آئی ٹی آئی میں ایک میٹنگ کا بھی انعقاد کیا گیا۔ سینٹر انچارج محمد مبشر خان اور ڈاکٹر فہیم اختر نے اس موقع پر اردو ادب پر روشنی ڈالی۔ یہ موبائل نمائش 15 جولائی، صبح آٹھ بجے سے خلیل العلوم نخاسہ، اجمل العلوم، آزاد گرلز کالج، انجمن چوراہا وغیرہ میں گشت کرے گی جہاں طلبہ اور محبان اردو کو مناسب قیمتوں پر کتابیں فراہم کی جائیں گی۔

یہ موبائل نمائش 12 جولائی کو گہوارۂ علم و ادب کہے جانے والے تاریخی شہر امروہہ پہنچی۔ موبائل نمائش پر آج دوسرے دن بھی لوگوں کی بڑی تعداد میں بھیڑ دیکھی گئی جہاں پر لوگوں نے کتابوں کی خریداری بھی کی۔ اس سلسلے میں وین انچارج وی صدیق نے نامہ نگار سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ امروہہ جیسی مردم خیز بستی میں اس طرح کی موبائل دکان کی بہت ضرورت تھی۔ اس لیے اس وین کو امروہہ لایا گیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کتابوں کو مناسب قیمت پر حاصل کر سکیں۔ بہت سی ایسی کتابیں جو کہیں دستیاب نہیں تھیں وہ بھی مل رہی ہیں۔ کل جامع مسجد پر اس وین نے کافی مقدار میں کتابیں فروخت کیں۔ جہاں پیش امام ڈاکٹر محمد طارق نے اس کا افتتاح کیا۔ آج یہ وین امروہہ کے امام المدارس انٹر کالج کے سامنے کتاب فروخت کر رہی ہیں۔ اس موقع پر امروہہ لائبریری کے بانی محمد عمر نے جا کر موبائل نمائش کا معائنہ کیا۔ انھوں نے اخبار کو بتایا کہ اس طرح کا کام آج کے دور میں بہت ضروری ہے۔ یہ کتابیں ہمارے مستقبل کی ضامن ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری کے سرپرست ہانی ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی نے کتاب موبائل نمائش کی امروہہ آمد پر تمام علمی شخصیات کو اس کے لیے مبارکباد پیش کی اور قومی کونسل کا شکریہ ادا کیا۔ حکیم اصرار الدین علوی نے امروہہ کے لوگوں سے درخواست کی کہ اس وین پر تشریف لا کر زیادہ سے زیادہ کتابوں کو خرید کر فائدہ اٹھائیں کیوں کہ یہاں پر بعض ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جو امروہہ میں نہیں مل پائیں گی۔ اس موقع پر امروہہ این سی پی یو ایل سینٹر کے سرپرست انیس فاروقی نے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا۔

اردو کی ترقی کے لیے مناسب اقدام کیے جائیں گے

● نئی دہلی۔ 12 جون، ہریانہ سرکار اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش اور ہر مناسب اقدام کر رہی ہے اور کرے گی۔ ان خیالات کا اظہار

ہریانہ کے وزیر اعلیٰ بھوپیندر سنگھ ہڈا نے کیا۔ وہ آج ایوان غالب میں ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری کشمیری لال ذاکر کے سلسلے میں منعقدہ ایک تقریب کو خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہریانہ اردو اکادمی حالی کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے نام پر ایوارڈ دیتی رہی ہے اور دیتی رہے گی۔ انھوں نے کہا کہ حالی کے مکان میں لڑکیوں کے اسکول کا قیام عمل میں آیا ہے اس کے علاوہ ہریانہ سرکار ان کے نام پر ایک میوزیم بھی قائم کرنے جارہی ہے انھوں نے کہا کہ ہریانہ سرکار اردو کی ترقی اور اس کی ترویج کے لیے کوشش میں لگی ہوئی ہے اور جہاں تک ممکن ہوسکے گا ہریانہ سرکار اس کے لیے تعاون کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ حالی اردو کے ''اگردوت'' تھے۔ انھوں نے اتحاد کا پیغام دیا اور آسان اردو میں شاعری کی۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ آج سے فخر ہریانہ ایوارڈ شروع کیا جارہا ہے جو کہ 1.51 لاکھ اور سند پر مشتمل ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایوارڈ کشمیری لال ذاکر کی 90ویں سالگرہ پر شروع کیا جارہا ہے۔ اس موقع پر کشمیری لال ذاکر پر لکھی گئی کتاب ''کشمیری لال ذاکر فن وشخصیت'' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ ہریانہ کے گورنر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ آج 90 سالہ نوجوان کی خدمات کا اعتراف کیا جارہا ہے جو ہم سب کے لیے خوشی کی بات ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہریانہ میں اردو کو آگے بڑھانے میں ان کا اہم کردار ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن شاہد، مالی، نند کشور وکرم، وائی اے قریشی وغیرہ نے بطور خاص شرکت کی جبکہ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔

(ہمارا سماج، دہلی)

اہلِ اردو اپنا حق لینے کی حکمتِ عملی تیار کریں

● بھوپال۔ 14 جون، مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے سابق چیئرمین عزیز قریشی نے یہاں ''اسکولی تعلیم کے ذریعے اردو کی بقا'' کے موضوع پر منعقدہ سہ ماہی ''کاروانِ ادب'' بھوپال کے سیمینار کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک سیکولر اور جمہوری ملک میں اس سے بڑھ کر کسی زبان پر ظلم کیا ہوسکتا ہے کہ اس کے دورِ عروج میں زبان کی گردن مارنے کا حکم جاری کردیا جائے اور یہ کام اتر پردیش کی ریاستی حکومت نے 1951 میں یکایک اردو کے بجائے ہندی کو ریاست کی سرکاری زبان بنا کر انجام دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ تقسیم کے المیے سے متاثر ہوکر اہلِ اردو بھی احساس کمتری میں مبتلا ہوگئے اور اپنی زبان کے لیے وہ نہیں کرسکے جو کرنا چاہیے تھا، لیکن اس سے زیادہ ستم کیا ہوگا کہ ایک اسٹبلشڈ زبان کو مٹانے کے لیے بڑے پیمانے پر سرکاری وسائل کا استعمال ہوا اور آج بھی جاری ہے۔ اس ناانصافی کا واحد علاج یہ ہے کہ اہلِ اردو کاسۂ گدائی لے کر پھرنے کے بجائے حکمرانوں پر واضح کردیں کہ ان کی زبان کو اس کے دستوری حقوق نہیں دیے جاتے تو وہ ہرگز ان کے حق میں اپنے ووٹ کا استعمال نہیں کریں گے۔ عزیز قریشی صاحب نے اردو یونیورسٹی کے قیام میں اپنوں اور پرایوں کے دوغلے کردار پر تلخ تجربات بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''گجرال کمیٹی'' جس کا بڑا شہرہ ہے، اس نے اپنی رپورٹ میں اردو یونیورسٹی کی مخالفت کی تھی۔ انھوں نے ناسازگار حالات کے باوجود اردو یونیورسٹی کے قیام اور ترقی اردو بورڈ کو ایک خودمختار ادارے کی حیثیت سے ترقی اردو کونسل میں تبدیل کرنے کا سہرا سابق وزیر فروغ انسانی وسائل ارجن سنگھ کے سر باندھتے ہوئے، ان کی انصاف پسندی کو خراج تحسین پیش کیا اور اردو کے نام پر اعلیٰ عہدے پانے والے دانشوروں کے بارے میں بتایا کہ اگر ان لوگوں کا بس چلتا تو وہ اردو یونیورسٹی ہرگز قائم نہ ہونے دیتے۔

سیمینار کے مہمانِ خصوصی اردو قومی کونسل کے نائب صدر چندر بھان خیال نے ملک میں اردو کے منظرنامے کو امید افزا قرار دیتے ہوئے کہا کہ آج اس زبان کی اہمیت سبھی تسلیم کررہے ہیں۔ ہندی اخبارات، کہانیوں اور مضامین میں اردو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے، اردو کے شیدائیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو کے اسکرپٹ سے نئی نسل کا تعلق کمزور ہورہا ہے۔ لہٰذا آج کا بنیادی مسئلہ اردو رسم الخط کو بچانا ہے اور اہلِ اردو اس سمت عملی قدم اٹھانے میں کافی پیچھے ہیں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں جنوبی ہند سے سبق لینا چاہیے کہ وہاں اردو محبان اردو کی سرپرستی میں پڑھی اور پڑھائی جارہی ہے اور یہ کام نہایت خاموشی سے ہورہا ہے۔ وہاں کے لوگ حکومتِ وقت کی طرف نہیں دیکھتے، دوسری طرف شمالی ہند کے ادیبوں کو اپنی کتابوں کی اشاعت اور شعرا کو مشاعرے پڑھنے میں دلچسپی ہے اور اساتذہ کو اپنی ڈگریوں اور نوکریوں کی فکر ہے۔ انھوں نے قومی اردو کونسل دہلی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اس کے ساڑھے تین سو سینٹر ملک بھر میں قائم ہیں، جہاں سے اردو کی تعلیم کا کام منظم ڈھنگ سے ہورہا ہے۔ چار سو سینٹر اردو طلبہ کو کمپیوٹر کمپوزنگ کی تربیت دینے میں مصروف ہیں، خیال صاحب نے ملک بھر میں پھیلے ہوئے مدارس کے کردار کو سراہتے ہوئے کہا کہ ان کے دم سے ہی آج اردو رسم الخط زندہ ہے۔ لیکن ہمیں اردو کے سیکولر کریکٹر کو بھی باقی رکھنا ہے۔ جب تک اردو زبان مجھ جیسے غیر مسلم بڑی تعداد میں نہیں پڑھیں گے اس کا یہ سیکولر کریکٹر طاقتور نہیں ہوگا، ہندوستان اسی وقت تک ایک سیکولر ملک کی حیثیت سے باقی رہے گا جب تک یہاں اردو زبان زندہ وموجود ہے۔

پروفیسر عتیق اللہ نے اپنی تقریر میں اردو کے بنیادی مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج اردو کے شب و روز سدھارنے پر گفتگو کا چلن ختم ہوگیا ہے۔ یہ سیمینار اس سمت ہماری رہبری کرسکتا ہے، انھوں نے شکایت کی کہ اردو

سے وابستہ اداروں میں مختلف پروجیکٹوں پر کروڑوں کا سرمایہ صرف ہو رہا ہے، لیکن مادری زبان کی ضرورت و اہمیت اور اس کو اس کا کے واقعی مقام دلانے پر خاطر خواہ توجہ نہیں ہے۔ شمالی ہند میں خود اہل اردو نے اپنی مادری زبان کے لیے ذمے داری ادا نہیں کی۔ سرکاری اسکول بند ہو گئے تھے تو اپنے اسکول قائم کرنا تھا، اس کے برعکس مہاراشٹر سے جنوبی ہند تک آج اردو اسکولوں او رکالجوں کی کھیپ کی کھیپ نظر آتی ہے۔ آج اردو کے رسائل مہاراشٹر، حیدرآباد، بہار اور مغربی بنگال میں تو پڑھے جاتے ہیں، شمالی ہند میں جو اردو کے علاقے تھے وہاں ان کے خریدار نہیں ملتے۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اپنے گھروں میں بنگالی ہندو بنگالی زبان، پنجابی ہندو پنجابی زبان، مہاراشٹرین مراٹھی زبان میں گفتگو کرتے ہیں لیکن متمول مسلمان انگریزی بولنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں دوسری زبانوں کے پرستاروں سے سبق لے کر اردو سے اپنا جذباتی وتہذیبی رشتہ استوار کرنا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی شکایت کی اہل اردو حکومت سے میسر رعایتوں کا فائدہ اٹھانے سے بھی قاصر ہیں۔

پروفیسر آفاق احمد نے اپنے مقالے میں اردو بذریعۂ میڈیم یا مضمون پڑھنے کے مضمرات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ ایک پیچیدہ سوال ہے اور اس پر ماہرینِ تعلیم اور ماہرین لسانیت کو غوروخوض کر کے اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ بعض کے خیال میں مذہب پڑھانے سے عاقبت سدھرتی ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اردو پڑھانے سے دین و دنیا دونوں سنورتے ہیں۔ جناب ایوب واقف (ممبئی) نے اپنے مقالے میں اردو ذریعۂ تعلیم کے طلبہ کے مسائل اور ان کے حل کا احاطہ کرتے ہوئے کہا کہ مہاراشٹر میں اردو تعلیم کی صورتِ حال اطمینان بخش ہے لیکن ٹیکنیکل تعلیم میں عام طور پر کافی دقتیں پیش آتی ہیں۔ اردو داں حلقوں کو اس کی فکر ہونی چاہیے۔ اگر مناسب طریقے پر یہ کام کیا جائے تو یقیناً اس کا مثبت نتیجہ برآمد ہوگا۔ لیکن عام طور پر اردو داں حلقوں کو ان مسائل کی فکر نہیں۔ موصوف نے سوال کیا کہ جب دیگر زبانوں کے طلبہ کو اپنی اپنی زبان کی تعلیم کے مواقع حاصل ہیں تو اردو والے اس سے کیوں محروم ہیں۔ ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے اپنے طویل مقالے میں اسکولی تعلیم کی ضرورت و اہمیت واضح کرتے ہوئے اس میں نیشنل ٹیکسٹ بکس کارپوریشن کے کردار پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ وہاں اردو کا نصاب ہی تیار نہیں ہوتا کتابیں بھی مرتب کی جاتی ہیں اور اساتذہ کی تربیت کا کام بھی انجام پاتا ہے۔ انھوں نے اردو کی لسانی خوبیوں اور وسعتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس میں اصطلاحات سازی کی ضرورت ظاہر کی اور پرستاران اردو سے اپنا محاسبہ کرنے کی اپیل بھی کی۔

اردو صحافی عارف عزیز نے اپنے مقالے میں اردو کے نام پر انجمن سازی کرنے والوں کے کاموں کا جائزہ لینے کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی مجلسوں کے شرکا یہ فیصلہ کرلیں کہ اردو ان کے گھروں میں زندہ رہے گی تو آج اس زبان کے شب و روز تبدیل ہوسکتے ہیں۔ انھوں نے ترجیحی بنیاد پر اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے انتظام و اردو کے حق میں فضا ہموار کرنے اور اس زبان کے بارے میں تعصب کا پردہ چاک کرنے پر زور دیا اور یہ بھی کہا کہ نئی نسل کو بتایا جائے کہ اردو کا ملک کی تقسیم سے کوئی تعلق نہیں، یہ پاکستان میں پھلی پھولی نہیں خالص ہندوستانی زبان ہے۔ ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں نے اپنے مقالے میں سہ ماہی کاروانِ ادب کی دس سالہ ادبی فتوحات پر روشنی ڈالی اور بھوپال کی اردو صحافت کا بھی مختصراً جائزہ لیا جبکہ پندرہ روزہ ''صدائے اردو'' کے ایڈیٹر نعیم کوثر نے سیمینار کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے حکومتی سطح پر اردو تعلیم کے لیے جدوجہد کا خاکہ پیش کیا اور بتایا کہ عزیز قریشی صاحب نے اس مہم کی سرپرستی کرنے کا یقین دلایا ہے۔ ابتدا میں تقریب کے میزبان اور ''کاروانِ ادب'' کے ایڈیٹر جاوید یزدانی نیز کوثر صدیقی نے مہمانوں کی گل پوشی کی۔ سیمینار کی نظامت اردو اکادمی کے سکریٹری اقبال مسعود نے انجام دیتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کو آج ابتدائی تعلیم کی شدید ضرورت ہے، اس کے بغیر وہ باقی نہیں رہ سکتی۔ پانچ سال تک اگر اس میں کچھ نہ لکھا جائے تو بھی یہ زبان زندہ رہے گی۔ (ندیم، بھوپال)

سچر سفارشات پر عمل آوری کے لیے کمیٹی کا مطالبہ

● نئی دہلی۔ 2 جولائی، زکوٰۃ فاؤنڈیشن آف انڈیا کے صدر ڈاکٹر سید ظفر محمود نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ اقلیتوں کے لیے وزیراعظم کے 15 نکاتی پروگرام اور سچر کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد کی نگرانی کے لیے متعلقہ ممتاز شہریوں پر مشتمل کمیٹی بنائی جائے۔ انھوں نے کہا کہ جب تک اس طرح کی کوئی آزاد مانیٹرنگ کمیٹی تشکیل نہیں کی جائے گی، اس وقت تک اقلیتوں کی فلاح و بہبود کی اسکیموں پر ایمانداری کے ساتھ عمل درآمد کا کوئی امکان نہیں۔

ظفر محمود نے کہا کہ جو کمپنیاں، ادارے اور آرگنائزیشنز اپنے یہاں نوکریوں میں تمام طبقات کو متناسب نمائندگی دیتی ہیں، ان کو کاروبار میں فروغ کے لیے کچھ چھوٹ دی جائے۔ انھوں نے کہا کہ پچھلی حکومت نے فلاحی اسکیموں کے نفاذ کے لیے ایکسپرٹ گروپ بنائے تھے۔ جنھوں نے اپنی رپورٹ حکومت کو سونپ دی ہے، لہٰذا ان کی رپورٹ کو بھی نافذ کیا جائے اور عام بھی کیا جائے۔ اوقاف کی کارکردگی کو بہتر بنانے اور اس میں تیزی لانے کے لیے آئی اے ایس کی طرح انڈین وقف سروسز کا آغاز کیا جائے اور ان سروسز کے کامیاب مسلم امیدواروں کو اوقاف کا سی ای او بنایا جائے۔ ظفر محمود

نے بتایا کہ سچر کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اس نکتے کی سفارش بھی کی ہے لیکن بیورو کریسی اس کی مخالفت پر آمادہ ہے اور حکومت نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کردیا ہے۔

انھوں نے مطالبہ کیا کہ حکومت اس تجویز پر عمل نہ کرنے کے اسباب بتائے اور یہ بھی بتائے کہ حکومت نے اس کا کیا متبادل نظم کیا ہے۔ انھوں نے وقف کی جائیدادوں کی واگزاری کے لیے اے ایس آئی اور اوقاف کی جوائنٹ کمیٹی بنانے کی بھی تجویز رکھی۔

سید ظفر محمود نے سول سروسز کے مسلم امیدواروں کی کوچنگ کے لیے اس کام میں مصروف تنظیموں کو مالی تعاون دینے، مدارس کے نصاب کو مختلف نوکریوں کے مساوی کرنے، مسلم اکثریتی اسمبلی اور پارلیمانی حلقوں کو دلتوں اور پسماندہ طبقات کے لیے ریزرو نہ کرنے اور آندھرا پردیش کی طرز پر مختلف باڈیز میں مسلمانوں کی نمائندگی بڑھانے کے لیے مسلمانوں کو نامزد کرنے کا بھی مطالبہ کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اہل ا... کی غفلت پر انگریز خاتون کی تڑپ

● حیدرآباد۔ 31 مئی، اردو اپنی مٹھاس، جاذبیت اور آسان ہونے کے باعث ہر خاص و عام کے دل میں بہت جلد اپنا مقام بنالیتی ہے تب ہی تو یہ لشکری زبان ہندو پاک کی سرحدوں سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گئی ہے۔ چنانچہ یہ پیاری زبان دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی پانچ زبانوں میں شامل ہے۔ لیکن افسوس تو یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ چمن اردو کی آبیاری کرنے والے ہی اس زبان سے دور ہوتے جارہے ہیں یہاں تک کہ اہل اردو کی اپنی ہی زبان سے بے مروتی و بے رغبتی نے ہندوستان میں اسے بے یارو مددگار کردیا ہے۔ لیکن مجھے قوی امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ ہر کسی کو بلالحاظ مذہب وملت رنگ ونسل وقومیت اپنی جانب راغب کرنے والی یہ عوامی زبان ایک بار پھر پہلے سے زیادہ ہم مقبولیت حاصل کرے گی اور اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں پھر سے اپنا گھر بسائے گی۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ان خیالات کا اظہار حسب عادت کسی لیڈر نے یا پھر اردو کے نام پر روزگار سے جڑی کسی ادبی شخصیت نے یا اس چمن کی آبیاری کرنے والے کسی بے غرض خدمت گزار نے کیا ہوگا۔ اگر آپ ایسا سوچ رہے ہیں تو یہ غلط ہے اردو کی شان میں اس طرح کا قصیدہ پڑھنے والی ایک برطانوی خاتون لینامٹ فورٹ ہیں جو دو روز قبل ہی حیدرآباد پہنچی ہیں۔ ان کے ادبی ذوق کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملک کے اس تاریخی شہر میں اپنی آمد کے 48 گھنٹوں میں ہی اپنی پہلی فرصت میں وہ انیسویں صدی کی کتابوں کو دیکھنے اور ان کے مطالعے میں مصروف ہوگئیں۔

لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں جنوبی ایشیائی زبانوں کے عہدہ کیوریٹر پر فائز لینامٹ فورٹ اردو بڑی عمدگی اور مہارت کے ساتھ نہ صرف لکھ اور پڑھ سکتی ہیں بلکہ انتہائی شائستہ انداز میں بولتی بھی ہیں۔ یہ انگریز خاتون عربی اور فارسی سے بھی بخوبی واقف ہے۔ ایک یادگار ملاقات میں لینا نے نمائندہ ''منصف'' کو بتایا کہ انھوں نے ہندوستان اور خاص کر اہلیان حیدرآباد کی انسان دوستی، مہمان نوازی اور مروت کے بارے میں کافی داستانیں سن رکھی تھیں جو حرف بہ حرف سچائی پر مبنی ہیں۔ لینا دنیا میں ہندوستان کی عظمت کا اعلان کرنے والے شہرۂ آفاق سالار جنگ میوزیم کی لائبریری میں تاریخی کتب کے معائنے اور مطالعے کے لیے دو یوم سے مسلسل یہاں آرہی ہیں۔ انھوں نے تعجب کا اظہار کیا کہ اہل حیدرآباد اہل زبان ہونے کے باوجود اردو سے اچھوت جیسا برتاؤ کررہے ہیں۔ انھوں نے نمائندہ ''منصف'' سے بات کرتے ہوئے انتہائی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ سالار جنگ میوزیم کی لائبریری کا شمار ملک کی مایۂ ناز لائبریریوں میں ہوتا ہے جہاں تاریخی کتب کا انمول خزانہ دعوت مطالعہ وتحقیق دے رہا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس لائبریری سے روزانہ صرف 2 تا 3 افراد ہی استفادہ کرتے ہیں۔ اردو کے بارے میں لینا کے خیالات جان کر قارئین کو یقیناً خوشی ہوئی ہوگی لیکن جس انداز میں انھوں نے اردو کے تئیں اہل اردو کی غفلت اور معاندانہ رویے پر روشنی ڈالی وہ ہمارے لیے تازیانۂ عبرت سے کم نہیں۔ اگر ہم اردو کے فروغ اور ترقی کے بارے میں اپنے اطراف واکناف کا ہی جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اظہار کی زبردست قوت رکھنے والی طاقتور اور اثرانگیز زبان کو جوش اور جذبے سے عاری اہل زبان ملے ہیں وہ اس کی ترقی کی باتیں تو بہت کرتے ہیں تاہم جب عمل کی بات آتی ہے تو پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ بے شک اردو کو تعصب پسند سیاست دانوں سے بہت نقصان پہنچا ہے وہیں ہم نے بھی اس زبان کے تئیں اپنی ذمے داریوں سے کوتاہی برتنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تب ہی تو ہم اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ شادیوں اور تقاریب کے رقعے تک انگریزی میں شائع کرواکر خود کو دانشور سمجھ بیٹھتے ہیں یہاں تک کہ اپنی دکانوں، اداروں اور تنظیموں کے سائن بورڈ بھی اردو میں تحریر کروانے میں عار محسوس کرتے ہیں۔ پھر بھی خود کو اردو کے خادم کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ ہم سال میں ایک آدھ مشاعرہ کرکے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اپنی زبان کی سالگرہ مناتے ہوئے ہم نے اپنا حق ادا کردیا ہے۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ کسی قوم کی بقا اس کی زبان و ادب اور تہذیب سے جڑی ہوتی ہے اور یہ بات مسلّمہ ہے کہ کسی قوم کو مٹانے کے لیے پہلے اس کی زبان کو مٹایا جاتا ہے۔ کاش ہم اہل اردو اب بھی ان باتوں کو سمجھیں اور اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں تو وہ دن

دور نہیں جب اردو ماضی کی طرح پوری شگفتگی سے ساری دنیا میں اپنی خوشبو بکھیرنے لگے گی۔
(منصف، حیدرآباد)

اردو اسکولوں کو ختم کرنے پر ہائی کورٹ برہم

● نئی دہلی۔ یکم جولائی، راجدھانی میں تقریباً 110 اردو اسکولوں میں برائے نام اساتذہ کی تقرری کنٹریکٹ (معاہدے) کی بنیاد پر کرنے پر آج ہائی کورٹ نے ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے دہلی سرکار سے جواب طلب کیا ہے کہ اردو اساتذہ کی تقرری عام اساتذہ کی طرح کیوں نہیں کی جارہی ہے۔ دہلی سرکار کے ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ کی طرف سے بتایا گیا کہ 144 عہدوں میں سے 90 عہدوں پر کنٹریکٹ (معاہدے) کی بنیاد پر اساتذہ کی تقرری کی گئی ہے۔ اس کے بعد بنچ نے ایم سی ڈی، این ڈی ایم سی اور دہلی سرکار سے اپنا جواب داخل کرنے کے لیے 29 جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ ایجوکیشن سیوا کمیٹی، گیتا ایجوکیشن سوسائٹی اور دیگر رضاکارانہ تنظیموں نے اس معاملے میں اپنے وکیل مشتاق احمد کے توسط سے مفاد عامہ کی عرضی میں اپیل کی ہے کہ اردو ٹیچروں کی تقرری عام اساتذہ کی طرح کی جائے اور سبھی خالی اسامیوں کو بھرا جائے۔ وکیل نے اس کے ساتھ ہی کہا کہ جن اسکولوں کو ختم کر دیا گیا ہے ان کو دوبارہ شروع کیا جائے اور اردو میڈیم کے مختلف مضامین کی کتابیں مہیا کرائی جائیں۔ وکیل نے بنچ سے یہ بھی مانگ کی ہے کہ وہ دہلی سرکار کو حکم دے کہ تمام اسکولوں میں ایڈوانس رجسٹر رکھا جائے تاکہ لوگ اردو کو اپنے مضمون کی شکل میں چن سکیں۔

چیف جسٹس اے پی شاہ کی صدارت والی بنچ کے سامنے پیش مفاد عامہ میں وکیل مشتاق احمد نے جرح میں کہا کہ راجدھانی میں ایم سی ڈی کے 65، این ڈی ایم سی کے 15 اور دہلی سرکار کے 30 اسکول ہیں جن کی تعداد 110 ہے۔ انھوں نے کہا کہ آر ٹی آئی کے تحت معلومات حاصل کرنے پر پتہ چلا کہ اردو ٹیچروں کی اسامیاں خالی پڑی ہیں اور ان پر جو بحالی کی بھی گئی ہے وہ معاہدے کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ عرضی میں اپیل کی گئی ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں میں جو دیگر مضامین کے ٹیچر پڑھا رہے ہیں ان کا ٹرانسفر کر کے اردو ٹیچروں کی بحالی کی جائے۔ یہ بھی کہا گیا کہ کیوں کہ دہلی میں اردو کو تیسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے اس لیے اسکولوں میں اردو کو ایک تو بطور مضمون اور دوسرے سرکاری زبان کے تحت پڑھایا جائے۔ جرح میں کہا گیا کہ جن اردو اسکولوں کو ختم کر کے دیگر اسکولوں میں مرج کر دیا گیا ہے ان اسکولوں کو دوبارہ بحال کیا جائے۔ اس کے علاوہ ٹیچرس ٹریننگ کوٹہ کے تحت اردو ٹیچروں کی ٹریننگ کا کوٹہ بڑھانے کی بھی مانگ کی گئی۔ بنچ نے اس معاملے میں دہلی سرکار سمیت دیگر فریقین سے جواب مانگا ہے کہ اردو ٹیچروں کی بحالی عام ٹیچروں کی طرح کیوں نہیں کی گئی۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

دوروزہ سیمینار ''اردو میں اسباق کی منصوبہ بندی''

● نئی دہلی۔ 16 جون، استاد اپنی زندگی میں ہی پل صراط سے گزرتا ہے اور اسے تنہا نہیں بلکہ طالب علموں کے پورے قافلے کے ساتھ اس پل صراط سے گزرنا ہوتا ہے۔ اساتذہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ طلبہ کی ضرورتوں کو سمجھیں اور اس حساب سے اپنی تدریس کا خاکا تیار کریں۔

اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی جانب سے منعقدہ دوروزہ قومی سیمینار کے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے یہ باتیں کہیں۔ انھوں نے حدیث کا حوالہ دیا کہ تعلیم ماں کی گود سے لے کر قبر تک حاصل کرنے کی شے ہے۔ اس کا سلسلہ کبھی نہیں رکنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اساتذہ کو ہمہ وقت نئی نئی باتیں جاننے اور سیکھنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

پروفیسر اختر الواسع نے نہایت جذباتی انداز میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے قول کو یاد کیا کہ استاد کی کتاب زندگی کا عنوان محبت ہونا چاہیے۔ انھوں نے حال میں موجود اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کو اس محبت کی روشنی اور چمک کو اپنی تدریس میں شامل کرنے کی صلاح دی۔ پروفیسر اختر الواسع نے مولوی اسماعیل میرٹھی کی ابتدائی کتابوں کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ آج بھی ایسے کامیاب درسی سلسلے تیار ہونے چاہیے۔

اختتامی اجلاس کا آغاز ڈاکٹر واحد نظیر کی تلاوت قرآن سے ہوا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر صفدر امام قادری نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر قاسم صدیقی نے اس دوروزہ سیمینار کی کامیابی پر ڈائرکٹر پروفیسر غضنفر کو مبارک باد دی۔ انھوں نے کہا کہ اس سیمینار میں تمام لوگوں نے محنت سے مقالے لکھے اور سب کو کچھ نہ کچھ یقیناً سیکھنے کا موقع حاصل ہوا۔

پروفیسر غضنفر نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور آخر میں اظہار تشکر کیا۔ سیمینار کی کوآرڈینیٹر ڈاکٹر زبیدہ حبیب نے سیمینار میں پیش کیے گئے 21 مقالوں کی تفصیل پیش کی اور ان کے خاص خاص نکات واضح کیے۔

''اردو میں اسباق کی منصوبہ بندی'' سیمینار کے دوسرے دن اختتامی تقریب کے علاوہ تین نشستیں ہوئیں۔ پہلی نشست پروفیسر محمد قاسم صدیقی، وائس چانسلر، جامعہ اردو، علی گڑھ کی صدارت میں ہوئی جس میں پانچ مقالے پیش کیے گئے۔ محترمہ عائشہ رحمان نے شاعری کی تدریس کے لیے سبق کی منصوبہ بندی کیسے ہو، اس سمت تفصیل سے اشارے کیے۔ ڈاکٹر واحد نظیر جو

پٹنہ سے تشریف لائے تھے،قصیدے کی تدریس کے موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے سودا کے ہجویہ قصیدے ''تضحیک روزگار'' کی منصوبہ بند تدریس پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر خالد محمود، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے نظم کی تدریس کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے اختر الایمان کی مشہور نظم ''ایک لڑکا'' کی مثالی تدریس کا نمونہ پیش کیا۔ ڈاکٹر شعیب عبداللہ نے سائنس کے اسباق کی منصوبہ بندی کی تفصیل پیش کی۔ ڈاکٹر مزمل حسین قاسمی نے جغرافیہ کے ایک مضمون کی تدریس کی منصوبہ بندی پیش کی۔

دوسری نشست پروفیسر ساجدہ زیدی اور پروفیسر خالد محمود کی صدارت میں ہوئی۔ اس نشست میں تین مقالے پیش کیے گئے۔ پہلا مقالہ پروفیسر قاسم صدیقی کا تھا جو سائنس کی تدریس کی باریکیوں کی وضاحت پر مبنی تھا۔ ان کے بعد ڈاکٹر نفیس احمد نے خواجہ حسن نظامی کے انشائیہ ''مچھر'' کی مثالی تدریس کا نمونہ پیش کیا۔ ڈاکٹر خطیب سید مصطفیٰ (پٹیالہ) نے قواعد کی تدریس کو موضوع بنایا۔ مقالات پر ڈاکٹر نجمہ رحمانی اور پروفیسر غضنفر نے اپنے تاثرات پیش کیے۔ پروفیسر ساجدہ زیدی نے صدارتی خطبے میں نشست میں پیدا ہوئے جواب طلب امور پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے روایتی اور جدید دونوں طریق ہائے تدریس کے امتزاج کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ روایتی طریقۂ تدریس کے بعض مناسب اور موثر پہلو بھی ہیں، ان سے صرف اس لیے صرف نظر نہیں کرلیا جانا چاہیے کہ وہ پرانے ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے کہا کہ تمام نئے تعلیمی نظریات پر بھی آمنا صدقنا کہنے کی ضرورت نہیں۔

اختتامی جلسے سے قبل سیمینار کا آخری اجلاس پروفیسر محمد نعمان خاں کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر ارشد اکرام اور ڈاکٹر حلیمہ سعدیہ نے انگریزی زبان وادب کی تدریس کے مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر ارشد اکرام نے انگریزی زبان کی تدریس کی نزاکتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اساتذہ کی ذمے داریوں کی جانب اشارہ کیا۔ ڈاکٹر حلیمہ سعدیہ نے بچوں کو انگریزی زبان کے خوف سے نجات دلانے کی عملی تراکیب کی وضاحت کی۔ محترمہ عصمت جہاں صدیقی نے اردو میں ریاضی کی اصطلاحات کی گراں باری اور انتشار کی بابت اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ پروفیسر محمد نعمان خاں نے خطبۂ صدارت میں کہا کہ اردو کے اساتذہ کو روایتی طریقۂ تدریس سے الگ ہوکر ہم عصر ضروریات اور تقاضوں سے ہم آہنگ تدریس کو آزمانے کی وکالت کرنی چاہیے۔

افتتاحی جلسے کے بعد سیمینار کی دو نشستیں ہوئیں۔ پہلی نشست کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبۂ لسانیات کے صدر پروفیسر علی رفاد فتیحی نے فرمائی۔ اس نشست میں ڈاکٹر نجمہ رحمانی (دہلی یونیورسٹی) نے قصیدے کی تدریس کی منصوبہ بندی کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر مہاراج کرشن کول، پرنسپل، اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر،لکھنؤ نے املا کے مسائل پر سنایا۔ دونوں مقالوں کے تعلق سے تفصیلی گفتگو ہوئی۔ پروفیسر اے آر فتیحی نے صدارتی کلمات کے دوران تعلیم کے نظریات میں نئی نئی تبدیلیوں پر روشنی ڈالی اور ان کے لیے تیار رہنے پر زور دیا۔

دوسری نشست کی صدارت پروفیسر احرار احمد اور پروفیسر اومکار کول نے کی۔ اس نشست میں پروفیسر شکیل اختر فاروقی نے شاعری کی تدریس کی منصوبہ بندی کے عنوان سے مقالہ سنایا۔ پروفیسر علی رفاد فتیحی (علی گڑھ) نے ''اردو حروف تہجی کی معیار بندی'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر صفدر امام قادری، صدر شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، پٹنہ نے صنف خاکا کی منصوبہ بندی کے تعلق سے تفصیلی گفتگو کی اور احمد جمال پاشا کے خاکے ''کلیم الدین احمد'' مشمولہ گلستان ادب (این سی ای آر ٹی، نئی دہلی، بارھویں جماعت) کو نمونے کے طور پر استعمال کیا۔ ڈاکٹر وسیم احمد خاں، سید راشد اکبر اور نعیم الحسن صاحبان نے اسی نشست میں اپنے مقالے سنائے۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر احرار احمد نے اکادمی کو مبارکباد دی کہ جو کام شعبۂ تعلیم کو کرنا تھا، وہ اردو اکادمی انجام دے رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اساتذہ کی تربیت کے لیے ایجوکیشن کالجوں میں منصوبۂ سبق کے جو پرانے ماڈل کام آرہے ہیں انھیں بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس اعتبار سے یہ سیمینار ایک تحریک کا کام کرے گا۔

(ڈاک سے)

زبانوں کے جھگڑے میں ہندوستانی گم

● علی گڑھ۔ 7 جون، زبانوں کے جھگڑے میں ہندوستانی کے گم ہوجانے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مہاتما گاندھی کے پوتے اور مغربی بنگال کے گورنر گوپال کرشن گاندھی نے آج یہاں اہل ہند کے سامنے ہندوستانی کو واپس لانے اور اسے جاری و ساری کرنے کی عرضی پیش کی۔ گاندھی یہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے 59 ویں کانووکیشن سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی جب ہمارے روزانہ کی بولی ہوا کرتی تھی تب ہندوستان کے باغ میں ہندی پر اردو کے عطر کی چھڑکن ہوتی تھی اور دوگنا نکھار آجاتا تھا اب اگر اردو حاضر ہے تو ہندی غائب اور ہندی موجود تو اردو گم۔ نہایت فصیح و بلیغ اردو میں تقریر کرتے ہوئے گاندھی نے کہا کہ ہندوستانی آج کم سننے میں آتی ہے، یہ افسوس کی بات ہے۔ افسوس اس لیے کہ ہمارا وطن ہندوستان کسی ایک مٹی، ایک دریا یا ایک پہاڑ سے نہیں بنا ہے۔ وہ کئی رنگوں سے بنا ہے۔ اپنے میل میں وہ بے میل ہے اور ہندوستانی اسی میل کی اہم اور خوبصورت مثال ہے۔

انھوں نے کہا کہ آج ہم انڈیا کے شہری ہیں، بھارت ہمارا دیش ہے اور

ہندوستان ہمارا وطن ہے۔ گورنر موصوف نے اس سلسلے میں ہندوستانی کے حوالے سے آئین ساز اسمبلی کے اندر اور باہر ہونے والی بحثوں پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شاندار تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے گوپال کرشن گاندھی نے کہا کہ اس کی تاریخ سنہری ہے، اس کی آواز ہمیشہ غور سے سنی گئی ہے، اس میں ہزاروں پھولوں کے رنگ کھلے ہیں اور کھل رہے ہیں۔

(ندیم، بھوپال)

اردو اور پنجابی دو روزہ ورکشاپ

● نئی دہلی۔ 10 جون، دہلی اقلیتی کمیشن، شعبہ اردو اور شعبۂ پنجابی، دہلی یونیورسٹی کے اشتراک سے اردو اور پنجابی زبانوں کے لیے دو روزہ کاؤنسلنگ اور ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا، جس میں اردو اور پنجابی زبان کے مسائل پر طلبہ و طالبات کے سوالوں کے جوابات متعلقہ افراد کے ذریعے دیے گئے۔ اس ورکشاپ میں بڑی تعداد میں اردو اور پنجابی کے طالب علموں نے اپنے کیریئر کے متعلق گفتگو کی۔ خاص طور پر 12ویں جماعت پاس کر کے آنے والے طلبہ نے۔ ان بچوں کو بتایا گیا کہ تعلیم جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ روزگار کے بہت سارے مواقع موجود ہیں۔ آج کی دنیا میں اردو اور پنجابی سے متعلق مختلف میدانوں میں بہت سی جگہیں خالی پڑی ہیں، جن کے لیے خود کو تیار کر کے اپنا مستقبل سنوارا جاسکتا ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے کالجوں میں اردو اور پنجابی زبانوں کے حوالے سے ان کے داخلے کے بہت سارے مسائل پر بھی گفتگو ہوئی اور انھیں ورکشاپ میں حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ بچوں کی جانب سے ان معلومات پر اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم (صدر شعبۂ اردو)، ڈاکٹر منجیت سنگھ (صدر شعبۂ پنجابی)، ڈاکٹر توقیر احمد خاں (سینئر ریڈر، شعبۂ اردو)، خالصہ کالج کے پرنسپل جسوندر سنگھ اور اقلیتی کمیشن کی جانب سے اس کے چیئرمین مسٹر کمال احمد فاروقی اور ممبران میں پشپیندر سنگھ اور آرنلڈ جیمس خصوصی طور پر شریک ہوئے۔ ان کے علاوہ کثیر تعداد میں دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ نے بھی شرکت کی۔ **(ہندوستان ایکسپریس، دہلی)**

دہلی اردو اکادمی کی نئی گورننگ کونسل کا اعلان

● نئی دہلی۔ 7 جولائی، دہلی سرکار نے اردو اکادمی کے لیے نئی گورننگ کونسل کا اعلان کردیا ہے۔ یہ پہلی ایسی گورننگ کونسل ہے جس میں لٹریری شخصیات کو ترجیح دی گئی ہے اور سیاسی وفاداریاں نبھانے والے کارکنان کو اکادمی سے دور رکھا گیا ہے۔ کونسل میں درس و تدریس سے وابستہ اہم شخصیات، دانشوروں، نقادوں، شعرا و ادبا کو رکن نامزد کیا گیا ہے۔

اس 28 رکنی گورننگ کونسل میں اردو اکادمی کے سابق سکریٹری سید شریف الحسن نقوی کو قائم مقام وائس چیئرمین مقرر کیا گیا ہے۔ گورننگ کونسل میں شامل ممبران میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے سربراہ پروفیسر اختر الواسع، دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر عبدالحق، ڈاکٹر اسلم پرویز، اردو اکادمی کے سابق سکریٹری اور معروف شاعر مخمور سعیدی، ڈاکٹر دھرمیند ناتھ، ڈاکٹر جی آر کنول، پروفیسر شمس الحق عثمانی، پروفیسر عتیق اللہ، بلراج کومل، نرمل سنگھ نرمل، اسلم پرویز، ڈاکٹر نگار عظیم، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین احمد، ڈاکٹر شاہد پرویز، ڈاکٹر عقیل احمد، ڈاکٹر قدسیہ قریشی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر نجیب اختر، مفتی عطاالرحمٰن قاسمی اور معصوم مرادآبادی شامل ہیں۔

خصوصی مدعوئین اراکین میں اطہر فاروقی، ڈاکٹر عظیم حیدر اور جوگندر پال کے نام شامل ہیں۔ ان کے علاوہ پرنسپل سکریٹری فائنانس، سکریٹری آرٹ اینڈ کلچر اور سکریٹری اردو اکادمی بھی کونسل کے رکن ہوں گے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

ایس سی ایس چینل پر اردو پروگرام کا آغاز

● دربھنگہ۔ 6 جولائی، شہر دربھنگہ سے نشر ہونے والے SCS کے اردو پروگرام کا باضابطہ افتتاحیہ پروگرام ڈان باسکو اسکول کے احاطے میں منعقد ہوا جس کی صدارت شمیم احمد فاروقی نے کی۔ جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے اشرف فرید، ڈاکٹر کے این پی سنہا شریک تھے۔ محفل میں ڈاکٹر رئیس انور، روی بھوشن چترویدی اور ابوالقیس تیز بھی موجود تھے۔ اس موقع پر سامعین سے خطاب کرتے ہوئے اشرف فرید نے کہا کہ SCS کا یہ اقدام قابل تعریف ہے۔ ڈاکٹر رئیس انور نے کہا کہ دربھنگہ کی سرزمین سے اردو پروگرام کا آغاز ایک مثبت قدم ہے۔ روزنامہ ہندوستان کے بیورو چیف روی بھوشن چترویدی نے کہا کہ دربھنگہ سے یوں تو کئی چینل کام کر رہے ہیں مگر SCS وہ واحد چینل ہے جس کی نظر انتخاب اردو پر پڑی اور اس نے ارو کا باضابطہ پروگرام آغاز کرنے کا ارادہ کیا۔ ڈاکٹر کے این پی سنہا نے کہا کہ اردو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان اور علمبردار ہے۔ آخر میں صدر مجلس شمیم احمد فاروقی نے کہا کہ SCS کے ذریعے اردو پروگرام کا آغاز فال نیک ہے۔ میں SCS کے ذمے داروں سے گزارش کروں گا کہ آپ اپنے چینل کے ذریعے سماج کے ہر طبقے کو ساتھ لے کر چلیں۔ شرکت کرنے والوں میں منور عالم راہی، مولانا ابو اختر قاسمی، مولانا مفتی جاوید اختر قاسمی، مولانا عبدالمتین قاسمی، عارف اقبال، عرفان احمد پیدل، محمد فاروق اعظم انصاری، سرفراز عالم، روی خان، علاء الدین

حیدروارثی، ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی، بابر خاں جالوی، منظرالحق منظر صدیقی، ڈاکٹر احسان احمد صدیقی، جنید عالم آروی، سکندر اعظم، کمیش کمار جھا، انیس احمد، ڈاکٹر اخلاق منظر، پروفیسر محمد بدرالدین، مولانا نسیم احمد قاسمی، ریاض خان قادری وغیرہ شامل تھے۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

مختصرات

● نئی دہلی۔ یکم جولائی، زبانیں بنتی یا بگڑتی نہیں بلکہ تبدیل ہوتی ہیں اور اس تبدیلی سے زبانیں مالا مال ہوتی رہتی ہیں، اردو بھی اس عمل سے گزرتی رہی ہے۔ اس سے اردو کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے اکادمی برائے فروغ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی جانب سے منعقدہ سات روزہ اورینٹیشن پروگرام برائے اردو اساتذہ، مدھیہ پردیش میں ان خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر قدوائی نے کہا کہ اکادمی کے منصوبوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نتائج یقیناً بہتر نکلیں گے اور ان سے اردو دنیا کو آگے چل کر بہت فائدہ ہوگا کیونکہ پروفیسر غضنفر علی بے حد محنت سے اکادمی کے پروگرام کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ زبان کے معاملے میں سخت گیری کام نہیں آتی اس سے زبان کو نقصان پہنچتا ہے۔ زبان کے سلسلے میں لبرل رویہ اپنانا چاہیے کیونکہ زبان جب کھلی فضا میں پلتی ہے تو زیادہ پروان چڑھتی ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ نے صدارتی خطبہ میں کہا کہ تعلیم میں سب سے بنیادی چیز طلبہ کو مائل کرنا ہے اس کے بعد قائل کرنے کی منزل آتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو والوں کا اردو سے تہذیبی، جذباتی اور روحانی رشتہ کمزور پڑتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے اردو کو کافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ اردو کی بقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس سے جذباتی اور تہذیبی رشتہ استوار کیا جائے اور اس رشتے کو نئی نسل کے ساتھ بھی جوڑا جائے۔ پروفیسر غضنفر علی ڈائرکٹر اکادمی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور اکادمی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اکادمی اس لیے قائم کی گئی ہے کہ یہ اساتذہ کی صلاحیتوں کو فروغ دے سکے۔ قلیل مدتی پروگرام کے ذریعے اردو اساتذہ اور اردو میڈیم اساتذہ کو درس و تدریس کے نئے طریقوں سے واقف کرا سکے۔ ڈاکٹر یاسمین خان اسٹیٹ کوآرڈی نیٹر مدھیہ پردیش نے اپنے صوبے کے اساتذہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ہمارے صوبے کے اردو اساتذہ کو پہلی بار کسی تدریسی پروگرام میں شرکت کا موقع ملا ہے یہ ہم سب کے لیے بے حد خوشی کی بات ہے جس کے لیے ہم سب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیرالحسن اور پروفیسر غضنفر علی ڈائرکٹر اکادمی کے شکرگزار ہیں۔ افتتاحی اجلاس کا آغاز تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ اس جلسے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر شہزاد انجم، کوآرڈی نیٹر اورینٹیشن پروگرام نے انجام دیے۔ اس سات روزہ اورینٹیشن پروگرام میں مدھیہ پردیش کے 45 اردو اساتذہ اور ماہرین تعلیم شرکت کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ دہلی اور دہلی کے باہر کے ماہرین تعلیم، اساتذہ اور دانشوروں کو لکچر کے لیے مدعو کیا گیا ہے۔

(صحافت، دہلی)

● کولکاتا۔ 9 جون، ریاست میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے کی تحریک چلا رہی انٹرنیشنل ہیومن رائٹس ایسوسی ایشن کے ریاستی انچارج شمیم احمد اور ایسوسی ایشن کے ارکان اور کارکنان نے تحریک اردو کے لیے دھرنا، مظاہرہ اور احتجاج سے الگ ہٹ کر آج گلی گلی اردو اخبارات فروخت کر کے ایک نئی روایت قائم کی۔ صبح کی اولین ساعتوں میں اردو کے متوالوں کا گروہ شمیم احمد کی قیادت میں مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال کے باہر سے نکل کر وارڈ نمبر 53 اور 62 کے ہر اردو خواں سے ملے اور ان سے درخواست کی کہ وہ اردو اخبارات خرید کر پڑھیں اور اس کا سلسلہ ابھی اور اسی وقت سے شروع کر دیں۔ جب تک ہم خود اپنی زبان کی پذیرائی نہیں کریں گے اردو میں شائع ہونے والے اخبارات خرید کر نہیں پڑھیں گے ہماری کسی بات کا حکومت نوٹس نہیں لے گی۔ آج ریاست کے وزیر اعلیٰ بدھادیب بھٹا چاریہ کہہ رہے ہیں کہ ہم 4 فیصد اردو آبادی کے لیے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ نہیں دے سکتے ہیں تو اس کے لیے انھیں یہ بتانا ضروری ہے کہ ہم 4 فیصد نہیں ہیں۔ ہمیں ہندسوں میں مقید کرنے کے بجائے ہمارے حقوق ادا کیے جائیں۔ جب دو فیصد نیپالی آبادی کے لیے نیپالی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا جا سکتا ہے تو اردو کو کیوں نہیں؟ ان کا کہنا تھا کہ اردو اخبارات کی تعداد اشاعت بڑھنے کے ساتھ ساتھ اردو آبادی کی قوت بھی مستحکم ہوگی اور ایک وقت ایسا آئے گا جب اخبار کی ایک سطر کی خبر سے ایوان حکومت میں زلزلہ آ جائے گا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● بھوپال۔ یکم جولائی، یہاں ایک سیمینار میں سابق ایم پی عزیز قریشی نے کہا کہ اردو کے ساتھ جو ناانصافی ہو رہی ہے اس کے لیے پرامن طور پر احتجاج کی ضرورت ہے اور اس کے لیے میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوں۔ انھوں نے کہا کہ اگر ایک ماہ کے اندر سرکار نے سرکاری دفاتر پر ہندی کے ساتھ اردو کی نیم پلیٹ نہیں لگائی تو ہم اردو والے اس کام کو خود انجام دیں گے چاہے ہمیں اس کام کے لیے جیل ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ ڈاکٹر یونس فرحت نے کہا کہ 6 جون کو وزیر اعلیٰ کو رابطہ کمیٹی کے ذریعے بھیجے گئے مطالبات پر سرکار نے غور نہیں کیا تو ایک ماہ بعد عزیز قریشی کی سربراہی میں تحریک چلائی جائے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ بھوپال میں پہلی بار 16 انجمنوں کی طرف سے اردو کے لیے آواز بلند کی گئی ہے۔ انھوں نے مدھیہ پردیش حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ

اردو اکادمی کا بجٹ 5 کروڑ کیا جائے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● الٰہ آباد۔ 18 جون، پانچ ریاستوں کی دوسری سرکاری زبان "اردو" کو اس کا آئینی حق دلانے کے لیے جدوجہد کرنے والی تنظیم "اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن" نے اتر پردیش کی وزیراعلیٰ کو مشورہ دیا ہے کہ ریاست کی پہلی سرکاری زبان ہندی کی طرح دوسری سرکاری زبان اردو کی تعلیم کو بھی لازمی کریں، کیوں کہ ریاست کے سرکاری ملازمین کو دوسری سرکاری زبان اردو کا علم نہ ہونے کی وجہ سے پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ریاست کی دوسری سرکاری زبان "اردو" کی تعلیم اتر پردیش کی عدالت عالیہ، نے 24 اگست 2004 کو فیصلہ دیا تھا کہ قانون اردو یعنی "یو پی آفیشیل لینگویج (امنڈمنٹ) ایکٹ 1989 کے نفاذ میں مؤثر اقدامات اٹھائے جائیں، مگر ملائم سنگھ نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ مایاوتی کی حکومت نے 2008 میں قانون اردو کے نفاذ کے لیے حکم نامہ تو جاری کردیا ہے مگر کوئی بھی محکمہ اس پر عمل درآمد نہیں کر رہا ہے، جس کی وجہ سے اردو داں عوام حکومت سے متنفر ہو رہے ہیں اور پارلیمانی انتخاب کے نتائج اس بات کا ثبوت ہیں۔ (ہمارا سماج، نئی دہلی)

● دیوبند۔ 24 جون، اردو ٹیچرس ویلفیئر ایسوسی ایشن دیوبند کے ذمے داران نے آج شہر کے نامور اسکول دون ویلی پبلک اسکول کے ذمے داران کو ایک مکتوب پیش کیا جس میں مانگ کی گئی کہ اسکول میں تعلیم حاصل کررہے 1200 طلبہ وطالبات میں سے 50 فیصد مسلم ہیں اس لیے ابتدائی درجات سے ہائی اسکول وانٹر تک اردو کی تعلیم کا نظم کیا جائے یو پی حکومت کی جانب سے اردو، بی ٹی سی 2 سالہ تربیتی کورس کے بعد اردو اساتذہ کی تقرری کی جارہی ہے اگر انگلش میڈیم اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا بہتر نظم ہو تو روزگار کے بہتر مواقع ہوں گے۔ بعد میں ایسوسی ایشن کے ذمے داران نے اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جہاں کہیں بھی محبان اردو موجود ہوں وہ اسے تحریک کی شکل دیں اور مسلم والدین ان اسکولوں کو اولیت دیں جہاں اردو تعلیم کا نظم ہو۔

(اخبار مشرق، نئی دہلی)

● پٹنہ۔ 30 جون، روزنامہ قومی تنظیم کے چیف ایڈیٹر جناب اشرف فرید کی صدارت میں گذشتہ 28 جون 2009 کو آڑھا، جموئی (بہار) میں ایک اردو بیداری کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ اردو کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب اشرف فرید نے کہا کہ ہر قوم اپنی زبان کے تئیں حساس اور بیدار ہے لیکن افسوس ہے کہ اہل اردو اپنی زبان سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ اردو زبان میں ہمارا تہذیبی سرمایہ محفوظ ہے۔ انھوں نے کہا کہ آڑھا جیسے دور دراز علاقے میں اردو بیداری کانفرنس کے انعقاد سے پتہ چلتا ہے کہ دیہی علاقوں میں اردو کے قدرداں بڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کو ایک مخصوص فرقے کی زبان قرار دینے کو ایک سازش کا حصہ بتاتے ہوئے کہا کہ اردو ایک قومی زبان ہے جس کے فروغ میں ہر فرقے اور مذہب کے لوگوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر بی ایچ خان نے کہا کہ صرف تقریریں کرنے یا اخباروں میں مقالات شائع کروانے سے اردو کے حقوق نہیں مل جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ صرف سرکاری مراعات مل جانے سے بھی اردو زبان کے استحکام کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ اس کی ترقی اور فروغ دراصل اسے اپنی زندگی میں برتنے پر منحصر ہے۔ انھوں نے اخلاص کے ساتھ اردو سے رشتہ جوڑنے اور اپنے بچوں کو اردو پڑھانے پر زور دیا۔

ڈاکٹر اعجاز علی نے کہا کہ نوجوان طبقے کے اردو تحریک سے منسلک ہونے سے اردو کے مستقبل کے تئیں ہماری امید بڑھی ہے کیونکہ جس تحریک سے نوجوان طبقہ جڑ جاتا ہے وہ اکثر کامیاب ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں بلکہ یہ ایک قومی زبان ہے جس نے ملک میں ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے جناب شریف قریشی نے کہا کہ اردو کی ترقی اسے اپنی روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرنے سے ہی ہوگی۔ زبیر احمد بھاگلپوری نے کہا کہ بہار میں الگ الگ تاریخوں میں "یوم اردو" منانے سے اردو طبقے میں ایک قسم کی گروہ بندی پیدا ہورہی ہے اور اس سے ایک غلط پیغام جارہا ہے۔ انھوں نے تمام محبان اردو سے اتفاق رائے سے "یوم اردو" منانے کے لیے کوئی ایک تاریخ متعین کرنے کی تجویز پیش کی۔ ان کے علاوہ قمرالباری دہمولوی اور نہال آڑھوی وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔ (ڈاک سے)

● جموں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) جموں وکشمیر نے ایک تقریب میں پدم بھوشن جناب بلراج پوری اور نامور ناقد ڈاکٹر ظہورالدین کی عزت افزائی کی۔ تقریب جموں کشمیر اکادمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز کمپلیکس میں واقع کے ایل سہگل ہال میں منعقد کی گئی جس کی صدارت جناب ایس ایس آنند لہر نے کی۔ انجمن کے جنرل سکریٹری جناب بلراج بخشی نے کہا کہ جناب بلراج پوری اور ڈاکٹر ظہورالدین نے اپنے اپنے شعبوں میں نمایاں کارکردگی سے ریاست جموں وکشمیر کو ملک بھر میں نہ صرف سربلندی عطا کی ہے بلکہ الگ الگ مشاغل کے باوجود ان دونوں حضرات کی مشترکہ خصوصیت یہ رہی ہے کہ انھوں نے اردو زبان وادب کے فروغ اور اشاعت کے لیے بے لوث خدمات سرانجام دی ہیں اور اردو سے والہانہ محبت ان کا شعار رہا ہے۔

شیخ سجاد پونچھی اور ڈاکٹر سیدہ نگہت نظر نے مقالات پیش کیے جن میں بلراج پوری اور ڈاکٹر ظہورالدین کی حیات، ان کی حصولیابیوں اور اردو کے تئیں ان کی خدمات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ کشمیر ٹائمز اخبارات گروپ کے چیئرمین جناب وید بھسین نے، جو مہمان خصوصی تھے، پدم بھوشن بلراج پوری کو اور اسٹیشن

ڈائرکٹر دوردرشن محترمہ نسیم خان نے ڈاکٹر ظہورالدین کو مومنٹو پیش کیے۔

اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے جناب وید بھسین نے کہا کہ بلراج پوری اور ظہورالدین جیسے دانشوروں اور محبانِ اردو نے جموں کی دانشورانہ وراثت میں اضافہ کیا ہے۔ جناب وید بھسین نے کہا کہ اردو تعصبات کا شکار ہوگئی ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ انجمن کے صدر جناب آنند لہر اور جنرل سکریٹری جناب بلراج بخشی اردو کے فروغ کے لیے ایک فعال و مثبت کردار ادا کریں گے۔

آخر میں جناب ایس ایس آنند لہر نے کہا کہ بلراج پوری اور ڈاکٹر ظہورالدین نے اردو کی اشاعت میں ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ریاست جموں و کشمیر میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا تھا۔ اس لیے حکومتِ جموں کشمیر کو ایک ''مہاراجہ پرتاپ سنگھ اردو ایوارڈ'' قائم کرنا چاہیے۔

پروگرام کی نظامت ڈاکٹر لیاقت جعفری نے کی۔ نائب صدر انجمن پروفیسر اسداللہ وانی نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا اور اظہار تشکر کیا۔ (ڈاک سے)

● حلقۂ اربابِ ذوق، چنچی (تملناڈو) نے مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر خالد سعید کی آمد پر ان کے اعزاز میں 19 جون بوقت شام پانچ بجے محمڈن پبلک لائبریری میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا۔ اسی نشست میں ریاست کے ایک علاقے جنجی کے اردو اسکول کے میر مدرس عبدالعزیز کی تدریسی خدمات کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔

تلاوتِ کلام پاک اور نعت خوانی سے جلسے کا آغاز ہوا۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے صدر محمود شریف کے صدارتی کلمات کے بعد مہمانوں کی شال پوشی کی گئی۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے معتمد ڈاکٹر حیات افتخار نے حلقے کے قیام سے لے کر اب تک اس کے زیرِاہتمام منعقدہ تمام ادبی نشستوں کی روداد پیش کی۔ نائب صدر ڈاکٹر سید سجاد حسین نے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر خالد سعید کی ادبی خدمات کا تعارف کراتے ہوئے ان کا خیر مقدم کیا۔

ڈاکٹر خالد سعید نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اردو زبان کی تدریس کے سلسلے میں پیدا ہونے والے مسائل کو موضوع بنایا جس میں انھوں نے طلبہ کی ذہنی سطح اور نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعلیم دینے پر زور دیا۔

پروفیسر قمر رئیس اور کاوش بدری کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر حیات افتخار نے ان کی ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا اور تعزیتی قراردادیں منظور کی گئیں۔

آخر میں شعری نشست کا انعقاد ہوا۔ جس کی نظامت محترمہ صبا مصطفےٰ نے کی۔ جناب اسحٰق عابد، شہزاد آبرو، امان اللہ امان، رفیق پاشا رفیق، پروین فاطمہ، صبا مصطفےٰ، سجاد ظہیر، حبیب اللہ شاہ، سالک نائطی اور ڈاکٹر خالد سعید نے اپنے کلام سے نوازا۔ (ڈاک سے)

● ریاست بہار کے فعال ادبی ادارے، علمی مجلس بہار، نے گذشتہ 31 مئی کو ''اردو بھون'' میں انجمن ترقی اردو بہار کے سابق صدر، الحاج ہارون رشید (مرحوم) کے یوم ولادت پر ایک تقریب کا اہتمام کیا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر شمشاد حسین نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے انجام دیے۔ اس موقع پر بہار کے معروف ادبا و شعرا اور صحافیوں کو ایوارڈز سے سرفراز کیا گیا اور ان کی خدمت میں شال اور توصیفی اسناد پیش کی گئیں۔ ایوارڈ یافتگان میں جناب معین کوثر کو ہارون رشید ایوارڈ، سینئر صحافی جناب عبدالرافع کو سہیل عظیم آبادی ایوارڈ، سید مظفر عالم ضیا عظیم آبادی کو راسخ عظیم آبادی ایوارڈ، ڈاکٹر کمال نادم کو عطا کاکوی ایوارڈ، ظفر صدیقی کو جمیل مظہری ایوارڈ، ڈاکٹر ریحان غنی کو غلام سرور ایوارڈ، منیر سیفی کو بہزاد فاطمی ایوارڈ، جناب شمیم قاسمی کو حفیظ بنارسی ایوارڈ، جناب انور شمیم کو پرویز شاہدی ایوارڈ، ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کو پروفیسر عبدالمغنی ایوارڈ، ناشاد اورنگ آبادی کو رمز عظیم آبادی ایوارڈ اور عبید قمر کو شین مظفر پوری ایوارڈ سے نوازا گیا۔

''ہارون رشید ایک ہمہ جہت شخصیت'' کے عنوان پر ڈاکٹر علیم اللہ حالی، جناب انیل سلبھ، جناب وجیہ الدین، ڈاکٹر کلیم الرحمٰن کاکوی اور حافظ یونس مشہدی نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے کہا کہ وہ ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے۔ وہ ملی، قومی، تہذیبی اور سماجی سروکار رکھنے والے تھے اور لوگوں کی مدد کرنا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ پروفیسر شمشاد حسین نے فرمایا کہ ہارون رشید صاحب وقت کے پابند آدمی تھے اور یہی ان کی کامیابی کا راز تھا۔ وہ ایک وضع دار انسان تھے۔ مہمان نوازی اور ضرورت مندوں کی مدد ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ ظفر صدیقی اور حسن نواب نے مرحوم سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ تقریب کا آغاز علمی مجلس بہار، کے جنرل سکریٹری پرویز عالم کے کلمات سے ہوا۔ انھوں نے اس ادارے کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور اعلان کیا کہ ایوارڈ کا یہ سلسلہ قائم رہے گا اور آئندہ بھی ادبا و شعرا اور صحافیوں کو ایوارڈ سے نوازا جائے گا۔ (ڈاک سے)

● حیدرآباد۔ 31 مئی، حیدرآباد کی نامور شاعرہ محترمہ عظمت عبدالقیوم کے فن اور شخصیت کو خراج پیش کرنے کے لیے زیراہتمام ادارہ ''میرا شہر میرے لوگ'' کی طرف سے محترمہ عظمت عبدالقیوم کی 21ویں برسی کے موقع پر ادبی اجلاس و مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ صدر ادارہ ''میرا شہر میرے لوگ'' صلاح

الدین نیر مدیر'' خوشبو کا سفر'' نے خیر مقدم کیا۔ پروفیسر احمد اللہ خان، سابق صدر شعبہ قانون جامعہ عثمانیہ نے صدارت کی۔ مہمانان خصوصی و مقررین کی حیثیت سے خلیل الرحمٰن سابق ایم پی، ای اسمٰعیل، رکن انسانی حقوق کمیشن، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، سید تراب الحسن (آئی اے ایس) ڈاکٹر وزارت رسول خان، ڈاکٹر بشیر احمد، ضیا قادری، امتیاز علی تاج، اسسٹنٹ ڈائرکٹر دوردرشن، شاداں تہنیت، نسیمہ تراب الحسن، انیس قیوم او رڈاکٹر اطیب انصاری نے شرکت کی۔ پروفیسر احمد اللہ خان نے کہا کہ عظمت عبدالقیوم نہایت وضع دار اور شاندار خاتون اور ایک منفرد شاعرہ تھیں۔ ای اسمٰعیل نے محترمہ عظمت عبدالقیوم کی علمی، تعلیمی اور ادبی خدمات کو خراج پیش کیا۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے مشورہ دیا کہ عظمت عبدالقیوم کے تمام شعری مجموعوں او رنثری کتابوں کو ایک جامع شکل میں شائع کیا جائے تو بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ امتیاز علی تاج نے محترمہ کی ایک نظم سنائی۔ اور شاداں وزارت رسول حاں نے اپنی ایک پراثر نظم'' ماں'' سنائی۔ نسیمہ تراب الحسن نے عظمت عبدالقیوم کی شاعری ان کی نثر نگاری اور محفل خواتین کی سرگرمیوں کے تعلق سے مضمون پڑھا۔ صلاح الدین نیر، ضیا قادری، حسن فرخ یوسف الدین یوسف، قاضی فاروق عارفی، ڈاکٹر طیب پاشاہ قادری، شاداں تہنیت، بصیر افضل، نجم قمر سوز اور نسیمہ تراب الحسن نے کلام سنا کر داد حاصل کی۔ قاضی فاروق عارفی کے شکریے پر یہ محفل اختتام کو پہنچی۔

(منصف، حیدرآباد)

اعزاز و اکرام

● اردو تھیٹر کے فروغ کے لیے اردو کے معروف ڈراما نگار اور ہدایت کار اقبال نیازی کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے گذشتہ دنوں مراٹھی کی ایک اہم تنظیم مہاراشٹر لوک کلیان کاری سنستھا (پنویل) نے انھیں ایک باوقار ایوارڈ فنکشن میں'' مہاراشٹر لوک رتن پرسکار'' سے نوازا۔ ایک مراٹھی کلچرل ادارے کی جانب سے اردو کے فنکار اقبال نیازی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں نوازے جانے پر اردو والوں نے مسرت کا اظہار کیا ہے۔ اقبال نیازی کو حال ہی میں مجروح اکادمی ممبئی نے بھی ایک خصوصی تقریب میں'' مجروح ایوارڈ'' سے نوازا تھا اور فلم اور اسٹیج کے مشہور اداکار جانی لیور نے بھی انھیں اپنے پروگرام میں اعزاز بخشا تھا۔

گذشتہ تیس برسوں سے اردو تھیٹر کے لیے کام کر رہے اقبال نیازی اب تک سو سے زائد اردو ہندی ڈرامے اسٹیج کر چکے ہیں۔ ان کے ڈراموں کے تین مجموعے شائع ہوئے ہیں اور انھیں کل ہند اور ریاستی سطح کے متعدد انعامات و اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ اقبال نیازی کی دو نئی کتابیں'' رنگ درشن'' اور '' اردو تھیٹر اردو ڈراما'' فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی کے تعاون سے شائع ہو رہی ہیں۔ وہ ممبئی یونیورسٹی سے حبیب تنویر فن اور شخصیت پر پی ایچ ڈی مکمل کر چکے ہیں۔ گذشتہ دنوں ممبئی میں 7/11 کے ٹرین بم دھماکے اور 26/11 کے دہشت گردانہ حملوں پر ان کا ڈراما'' یہ کس کا لہو ہے؟ کون مرا؟'' کو عوام اور پریس نے بیحد سراہا اور اب تک اس کے 42 شو ہو چکے ہیں۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی۔ 9 جون، برصغیر کے ممتاز خطیب، شاعر و ادیب علامہ طالب جوہری کی ہندوستان آمد پر مولانا محمد عبادت ایجوکیشنل سوسائٹی (رجسٹرڈ) امروہا کی جانب سے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر دہلی میں موصوف کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے وائس چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کی۔ پروگرام کا آغاز تلاوت کلام پاک اور ڈاکٹر تابش مہدی کی نعت سرور کائنات سے ہوا۔ سوسائٹی کے صدر مولانا ڈاکٹر سید محمد سیادت نقوی نے مہمان خصوصی کا استقبال کیا۔ علامہ سید عقیل الغروی نے کہا کہ علامہ طالب جوہری صحیح معنوں میں علامہ کہلانے کے مستحق ہیں کیونکہ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی تفسیر قرآن'' احسن الحدیث'' اس کا ثبوت ہے جس کی دو جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی تالیف'' عقلیات معاصر'' پس آفاق اور'' حرف نمو، جیسے شعری مجموعے ان کی بے پناہ شعری صلاحیتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ مہمان خصوصی علامہ طالب جوہری نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ برقرار رکھیں اور اپنی روایت و میراث کو باقی رکھتے ہوئے جدید تہذیب کی خامیوں کو اجاگر کریں اور معاشرے میں ایک مبلغ کا کام انجام دیں۔ پروگرام میں ڈاکٹر ناشر نقوی کے شعری مجموعے'' انگنائی'' کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ تقریری سلسلے کے بعد شعری نشست منعقد کی گئی جس میں طالب جوہری، مخمور سعیدی، زبیر فاروقی، شفاعت فہیم، شہپر رسول، فرحت احساس، طرب ضیائی، ہمایوں ظفر زیدی، میکش امروہوی اور شان حیدر بیباک نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ حاضرین میں قمر احمد زیدی، وصی احمد نعمانی، ڈاکٹر احسن اختر سروش، سید مبارک، عابد طاہر، غلام حیدر، پیمبر امروہوی وغیرہ کے اسما قابل ذکر ہیں۔ نظامت ناشر نقوی نے کی اور ڈاکٹر حسین اختر نے شرکائے محفل کا شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی۔ 18 جون، ہالینڈ میں مقیم مشہور ادیب فاروق خالد کے دہلی تشریف لانے پر ان کے اعزاز میں ایک جلسے کا انعقاد غالب اکادمی، نئی دہلی میں کیا گیا۔ مہمان کا تعارف کراتے ہوئے'' آج کل'' کے مدیر ڈاکٹر خورشید اکرام نے کہا کہ فاروق خالد ایک اچھے افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔ ان کی

پہلی کہانی ''آج کل'' میں 1970 میں شائع ہوئی تھی۔ 1970 میں ان کے ناول ''سیاہ آئینے'' پر پاکستان کا آدم جی ایوارڈ ملا تھا۔ سفرنامے پر ان کی تین کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ فاروق خالد ہالینڈ کے ادارۂ ترقیات تراجم ڈچ ادبیات سے وابستہ ہیں۔ اس موقع پر فاروق خالد نے افسانہ ''ایک'' سنایا جس میں یوروپین معاشرے میں نسلی پیچیدگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ گفتگو میں انھو ں نے کہا کہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی 16 جلدیں ہالینڈ سے ہی شائع ہوئی ہیں۔ ہالینڈ کی لائبریریوں میں اردو کتابیں اور رسالے مل جاتے ہیں۔ جلسے میں انجم عثمانی، ذکیہ ظفر، نسیم عباسی، شاداب حسین، راشد حسین، ڈاکٹر نگار عظیم، ظہیر احمد برنی، مشرف عالم ذوقی، ڈاکٹر عقیل احمد، جہان اردو کے ایڈیٹر ڈاکٹر مشتاق احمد وغیرہ نے شرکت کی۔ **(صحافت، نئی دہلی)**

● حیدرآباد۔ 6 جون، ریاستی وزیر اقلیتی بہبود و پرائمری ایجوکیشن محمد احمد اللہ نے کہا کہ سماج میں اساتذہ کا مقام بلند ہے۔ نئی نسل کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے اور ان کے مستقبل کو سنوارنے میں ٹیچر کا اہم رول ہوتا ہے۔ چنانچہ اردو اکادمی کی جانب سے اس سال 88 اساتذہ کو ان کی نمایاں خدمات کے پیش نظر بیسٹ ٹیچر ایوارڈ عطا کیے جارہے ہیں۔ وہ آج جوبلی ہال باغ عامہ میں اردو اکادمی کے زیر اہتمام منعقدہ بیسٹ ٹیچر ایوارڈ تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان بھر میں آندھرا پردیش اردو اکادمی کا بجٹ سب سے زیادہ یعنی 36 کروڑ ہے۔ احمد اللہ نے کہا کہ ڈاکٹر راج شیکھر ریڈی کی زیر قیادت کانگریس حکومت اقلیتوں کی تعلیمی، معاشی و سماجی ترقی کی پابند ہے۔ اقلیتوں کا سالانہ بجٹ جو 180 کروڑ ہے اس میں مزید اضافہ کیا جائے گا۔ صدر نشین اردو اکادمی مولانا رحیم الدین انصاری نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں تعلیمی اداروں اور معاشرے میں استاد کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بہتر معاشرے کی تشکیل میں اساتذہ کا اہم رول ہوتا ہے۔ چنانچہ 88 اساتذہ کی خدمات کے اعتراف میں اردو اکادمی کی جانب سے فی کس 5 ہزار روپے اور سرٹیفکیٹ پیش کیا جارہا ہے۔ اس تقریب میں نائب صدر اردو اکادمی ایس کے افضل الدین ڈائرکٹرز ڈاکٹر ایم اے انصاری، نجیب احمد، واجد حسین، محمد موسیٰ قاسم، محمد منیر الدین کے علاوہ انگریزی قائدین کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ **(سالار، بنگلور)**

مشاعرے

● نئی دہلی۔ 21 جون، مجاہد آزادی محمد یونس میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام دہشت گردی اور تشدد کے خلاف اور قومی یکجہتی وسماجی ہم آہنگی کے فروغ کے لیے ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد گذشتہ شب انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں کیا گیا۔ جس کی صدارت پدم شری بیکل اُتساہی نے کی اور افتتاح جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین چندر بھان خیال، بین الاقوامی ٹرسٹ برائے فروغ اردو زبان و ادب کے چیئرمین اے۔رحمن ایڈووکیٹ ساجھے داری ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے چیئرمین محمود احمد صدیقی اور جوائنٹ پولیس کمشنر قمر احمد مہمانان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔

مشاعرے کی نظامت پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے اپنے مخصوص اور باوقار انداز میں کی۔ افتتاحی کلمات میں سید شاہد مہدی نے مشاعرے کی اہمیت اور معنویت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس موقع پر فاروق ارگلی کے مرتب کردہ کلیاتِ احمد فراز کا اجرا بھی کیا۔ مشاعرے کی آرگنائزنگ کمیٹی کے چیئرمین خواجہ خلیل اللہ، صدر صفدر ایچ. خان، نائب صدر خواجہ کلیم اللہ اور سکریٹری خواجہ سعید اللہ نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اس موقع پر پاکستان کے ہائی کمشنر شاہد ملک نے خصوصی طور پر شرکت فرمائی۔ انھیں کلیات احمد فراز کی ایک جلد بھی پیش کی گئی۔ اس تقریب میں عالمی اردو کانفرنس کے بانی مرحوم علی صدیقی کی اردو شعروادب کی خدمات کو بھی یاد کیا گیا اور انھیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ مشاعرے کے ابتدائی حصے کی نظامت فاطمہ خلیل اللہ نے کی۔ آخر میں خواجہ خلیل اللہ نے اظہار تشکر کیا۔ ابتدا میں شاہین سروش نے رفعت سروش کی نعت اور کچھ نعتیہ رباعیاں پیش کیں۔ مشاعرے میں جن شعرا نے اپنے کلام سے نوازا ان کے منتخب اشعار پیش ہیں۔

کبھی دروازے سے تہذیب گھر کی جان لیتے ہیں
سلیقہ جاننے کو گھر کی انگنائی بھی ہوتی ہے
بیکل اُتساہی

اردو کے حریفوں کو یہ معلوم نہیں، وہ
یکجہتی ملت کا کفن بیچ رہے ہیں
گلزار دہلوی

جو زخم عزیزوں نے محبت سے دیے ہوں
وہ زخم زمانے کو دکھانے نہیں ہوتے
مخمور سعیدی

کسی مجبور کی آنکھوں میں دیکھا
تو یہ دنیا نظر آئی بہت ہے
وسیم بریلوی

کیسا دور آیا کہ آنکھوں کی مروت بھی گئی
پاس رہ کر بھی کئی رشتے دھواں دینے لگے
فصیح اکمل

جستجو کے پاؤں اب آرام سا پانے لگے
اب ہمارے پاس بھی کچھ راستے آنے لگے
چندر بھان خیال

فرِ ملت بنے تھے مشکل سے
فخر سے ف ہٹا دیا تم نے
اسد رضا

اے مرے دل ترا سوچا نہیں ہونے والا
وہ جو سب کا ہے وہ تیرا نہیں ہونے والا
نصرت ظہیر

ہمارے عہد نے ہم کو دیا ہے یہ منصب
خود اپنے قتل میں قاتل کی رہبری کرنا
فاروق ارگلی

تعلقات نبھانا کوئی مذاق نہیں
دیا ہواؤں کے رُخ پر جلانا ہوتا ہے
شہباز ندیم ضیائی

جس سے اس آفتاب کی ضو شرمسار ہو
ایسا بھی کوئی داغ جگر ہم کو بھیج دے
ڈاکٹر ایم۔ آر قاسمی

شہر میں رسم ہے انسان سے بیزاری کی
گاؤں میں اب بھی روایت ہے رواداری کی
شمس رمزی

ہوا ہو، پھول ہو، خوشبو ہو یا دھواں تم ہو
مرے وجود میں بولو کہاں کہاں تم ہو
ڈاکٹر عفت زریں

قلم چلنے لگیں جب مصلحت کی روشنائی سے
تو پھر جھوٹی ہوں تحریریں تو اس میں یار حیرت کیا
سلیم صدیقی

بلندیوں کی لیے دل میں آس بیٹھا ہے
منڈیر پر جو کبوتر اداس بیٹھا ہے
سید مہتاب حیدر صفی پوری

شہرت کو وہ خود اپنی کمائی نہ سمجھ لے
مشہور ہے جب تک کہ وہ مغرور نہیں ہے
ماجد دیوبندی

عظمتیں پیٹتی ہیں سر اپنا
اب تو بونے خطاب دینے لگے
ملک زادہ جاوید

اشکوں کی اک لکیر سی آنکھوں میں کھنچ گئی
آیا نہ یاد جب کوئی حرف دعا مجھے
اقبال اشہر

دل جس مقام پر تھا وہاں دل نہیں رہا
کمبخت کھو گیا ہے کہیں مل نہیں رہا
انا دہلوی

عظمتوں والے ہیں جو خاک نشیں ہوتے ہیں
یہ وہ کہسار ہیں جو زیرِ زمیں ہوتے ہیں
معین شاداب

یوں تو سب سامان پڑا ہے
لیکن گھر ویران پڑا ہے
سریندر شجر

اس کے علاوہ اعجاز پاپور، احمد علوی، فرحین اقبال، سرور نگینوی، وارث وارثی، ایشیا ناز اور رفیق شیو پوری وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● رام پور۔ 28 جون، بھارتیہ اتحاد مسلم مہاسنگھٹن کے زیر اہتمام ایک مشاعرے کا انعقاد پان دریبہ کے میدان میں کیا گیا۔ محمد احمد خاں کاوش کی زیر سرپرستی سینٹرل ایکسائز کے سپرنٹنڈنٹ زبیر مسعود خاں کی صدارت اور حافظ مکارم الحق مکارم کی نظامت میں ہونے والے مشاعرے کی شمع صولت پبلک لائبریری کے چیئرمین س ش عالم نے روشن کی۔ مشاعرے کے کنوینر ظریف ندیم خان نے اس مشاعرے کا اہتمام کیا۔ مشاعرے میں رامپور کے تمام ادبی اسکولوں کے منتخب شعرا نے اپنا کلام پیش کیا:

بتا سکیں گے وہ مفہوم سعی لا حاصل
جو احتیاط سے تارے شمار کرتے ہیں
شوق اثری

جسم تو خاک ہے اور خاک میں مل جائے گا
میں بہرحال کتابوں میں ملوں گا تم کو
ہوش نعمانی

اب یہ معیار شہریاری ہے
کون کتنا بڑا مداری ہے
اظہر عنایتی

یوں ہوا پھر اس کے پیروں سے زمیں بھی چھن گئی
آسماں چھونے کا اس میں حوصلہ بھی تھا بہت
جاوید نعیمی

رنگ بہہ جائیں تو پھر کچھ اور پہلو سوچنا
پہلے میں تصویر پانی پر بنا کر دیکھ لوں
منظر واحدی

اس کی پسند اپنی انا کا ستون تھا
میری رگوں میں میرے بزرگوں کا خون تھا
فرید شمسی

یہ سوکھی ٹہنیاں ہیں لچک تک نہ آئے گی
ہمت اگر ہے تجھ میں تو ہم کو جھکا کے دیکھ
شہنشاہ صابری

کسی اچھی خبر کی آرزو ہے
مکمل بے خبر ہونے سے پہلے
شاہد محمود

بولتا تھا جو ترے نام کا طوطی ہر سو
اڑ گیا آج ترے ہاتھ کا طوطا کیسے
شکیل وفا ضیائی

پھول کیا خریدیں گے خوشبوؤں کے سوداگر
یار ہم تو زخموں کا کاروبار کرتے ہیں
ذوالفقار عادل

اکثر جھوٹی باتیں لوگ
قسمیں کھا کر کہتے ہیں
ضیا عنایتی

دیکھنا کتنے پستہ قد ہوں گے
سائے دیوار سے اتر جائیں
خلیل واحدی

پھر کیا تھا وہ پگھلنے لگا موم کی طرح
میں نے اسے سنایا تھا اک شعر میر کا
دانش رامپوری

صلہ نیکی کا پوری زندگی ملتا ہی رہتا ہے
وہ دریا سوت ہوں جس کے سدا بہتا ہی رہتا ہے
آزر نعمانی

ایمان و عمل کے بستر پر دن بھر کے تھکے تن کو رکھ کر
جب سوچا ہے دنیا کیا ہے آرام کے لمحے کھوئے ہیں
افتخار طاہر

آشنائی ہوئی وہ خود سے کہ محرم ہوئے سب
دامن اب کس کا پکڑیے کہ بڑے کم ہوئے سب
ظہیر رحمتی

جو مکاں لمس شناسی کا ہنر جانتے ہیں
ان کو دستک کی ضرورت ہے صدا مت دینا
س ش عالم

حکومت کی طرف سے کاغذی احسان ہوتے ہیں
عمل کچھ بھی نہیں ہوتا فقط اعلان ہوتے ہیں
غفران فریدی

علاوہ ازیں عبداللہ خالد، مکارم الحق مکارم، بیخ رامپوری، حامد رامپوری، آل احمد سرور اور منظر سیفی نے بھی کلام سے نوازا۔ **(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)**

● نئی دہلی۔ 6 جولائی، شاعری لفظ کی جادوگری کا نام ہے اور لفظ کی جادوگری یہ ہے کہ لفظ تصویر بن جائے، سُر میں ڈھل جائے، تال میں تبدیل ہو جائے اور لفظ رقص کرنے لگے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر غضنفر ڈائرکٹر اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اساتذہ نے اکادمی کی جانب سے منعقدہ مخصوص شعری نشست میں بحیثیت مہمانِ خصوصی فرمایا۔ اس شعری نشست کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ غضنفر چونکہ ایک ادیب ہیں، وہ جانتے ہیں کہ تعلیمی اور تدریسی پروگرام کے دوران ادبی نشستوں کے انعقاد سے ان کی وقعت اور قدر و قیمت مزید بڑھ جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مخصوص شعری نشستیں ہوتی رہنی چاہئیں۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شہزاد انجم نے انجام دیے۔ درج ذیل شعرا نے کلام سنایا: محترمہ حسن آرا، محمد ارشاد اسماعیل اور ڈاکٹر محبوب خان۔ **(صحافت، نئی دہلی)**

رسم اجرا

میرا: شخصیت اور فن

● نئی دہلی۔ 4 جولائی، کوئی ادیب جب لکھتا ہے تو وہ صرف زبان نہیں لکھتا بلکہ اس زبان میں اپنی ذات کو ادا کرتا ہے۔ میرا نے اپنی شاعری میں اپنی ذات کا اظہار کیا ہے۔ یہ بات معروف افسانہ نگار جوگندر پال نے ڈاکٹر ثروت خان کی مرتبہ کتاب ''میرا: شخصیت اور فن'' کی رسم اجرا کے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے کہی، جس کا انعقاد غالب اکادمی میں اردو پریس کلب کی

جانب سے کیا گیا تھا۔ جوگندر پال نے کہا کہ خود کو پانے کے لیے اپنے تمام وسائل اور عیش و آرام کو تجنا پڑتا ہے اور میرا نے یہ قربانی دی تھی۔ کتاب کا اجرا قومی کمیشن برائے خواتین کی چیئر پرسن اور لوک سبھا ممبر ڈاکٹر گرجا ویاس نے کیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے میرا کی شخصیت اور ان کی شاعری میں ''انکار'' کے فلسفے پر روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے کہا کہ میرا عشق کی شاعرہ ضرور ہیں لیکن بڑا روحانی عشق جذبات سے زیادہ مزاحمت اور احتجاج پر یقین رکھتا ہے۔ میرا کے عشق میں برہمنی فکر کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔

اس موقعے پر سوامی اگنی ویش، مخمور سعیدی، بار کونسل آف انڈیا کے رکن ہیم راجندر ریڈی، اسد رضا، ڈاکٹر ثروت خان، ڈاکٹر نگار عظیم، ڈاکٹر مولا بخش، پیغام آفاقی، ڈاکٹر تسنیم خانم، ڈاکٹر کلثوم بانو نے بھی اظہار خیال کیا۔

آخر میں موہن لال سکھاڑیہ یونیورسٹی کے پروفیسر پرتم سنگھ جھنڈاری نے میرا کا صوفیانہ کلام اپنی مترنم آواز میں پیش کیا۔ اردو پریس کلب کے جنرل سکریٹری محمد طارق فیضی نے اظہار تشکر کیا۔ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ جلسے میں پروفیسر علیم اللہ حالی، فاطمہ وصیہ جائسی، فصیح اکمل، منصور احمد عثمانی، حقانی القاسمی، عظیم اختر، ملک زادہ ایڈووکیٹ، نوید ملک، نسیم عباسی، ڈاکٹر شہلا نوید، ظہیر برنی، فرحان چودھری، نوازش مہدی، ثمرین ناز، حنیف، خالد شر اعظمی، اے معین اختر جے پوری سمیت مختلف شخصیات موجود تھیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

پروفیسر محمد افضل الدین اقبال: حیات اور ادبی خدمات

● حیدرآباد۔ 27 جون، حیدرآباد کی علمی و ادبی شخصیتوں نے پروفیسر محمد افضل الدین اقبال سابق صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی علمی و ادبی خدمات کو خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے پروفیسر افضل الدین کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اردو کے ممتاز ادیب، محقق اور نقاد تھے۔ یوسف شرف الدین ادبی و مذہبی ٹرسٹ اور اردو ماس کمیونکیشن کے زیر اہتمام گولڈن جوبلی ہال روزنامہ ''سیاست'' میں ''پروفیسر محمد افضل الدین اقبال: حیات اور ادبی خدمات'' کے موضوع پر کتاب کی رسم اجرا تقریب میں علمی و ادبی شخصیتوں نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ مہمان خصوصی جناب زاہد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ ''سیاست'' کے ہاتھوں کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ اپنی تقریر میں جناب زاہد علی خاں نے کہا کہ ڈاکٹر افضل الدین اقبال نے اپنی تحقیقی کاوشوں سے اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی تصنیف کردہ 9 کتابوں کو اردو اکادمی نے منتخب کیا لیکن افسوس کہ انھیں اردو کی خدمات کے سلسلے میں کارنامۂ حیات ایوارڈ نہیں دیا گیا۔ یہ حیدرآباد کے نقاد اہل قلم کی بدنصیبی ہے کہ انھیں ان کا حقیقی مقام نہیں دیا جاتا۔ جناب زاہد علی خاں نے ادارۂ سیاست کے تحت چلائے جانے والے اردو کمپیوٹر ٹریننگ سنٹر کے ایک ٹاپر کو ہر سال ڈاکٹر افضل الدین اقبال کے نام سے 5 ہزار روپے پر مشتمل ایوارڈ دینے کا اعلان کیا۔ جسٹس محمد اسماعیل رکن انسانی حقوق کمیشن آندھراپردیش نے اپنی تقریر میں کہا کہ پروفیسر افضل الدین نے عثمانیہ یونیورسٹی میں ایک لیب اسسٹنٹ سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا لیکن وہ اس پر منحصر نہیں رہے بلکہ سخت محنت اور جستجو سے تعلیمی قابلیت پیدا کی اور اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آج کی نئی نسل کو پروفیسر افضل الدین کی زندگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے مستقبل کو سنوارنا چاہیے۔ پروفیسر عبدالرحیم سابق صدر شعبۂ صحافت عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنی تقریر میں کہا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو صحافت کورس شروع کرنے کے لیے پروفیسر اقبال نے اہم رول ادا کیا ہے۔ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے کہا کہ پروفیسر افضل اقبال کی تحقیقی وتنقیدی زندگی کا نقش اول اور نہایت وقیع مقالہ ''مدارس میں اردو ادب کی نشوونما'' ہے۔ ایس کے افضل الدین نائب صدر اردو اکادمی نے کہا کہ وہ مرحوم کو کارنامۂ حیات ایوارڈ کے لیے نمائندگی کریں گے۔ جناب سید عبدالقادر، پروفیسر سعود جعفری، انیس احمد اقبال، ڈاکٹر موسیٰ اقبال، ڈاکٹر احتشام نعمت اللہ نے اپنی تقاریر میں پروفیسر افضل الدین کی علمی خدمات کو خراج ادا کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم نے اپنی محنت اور لگن سے اردو ادب میں اپنی ایک علاحدہ شناخت بنائی تھی۔ ابتدا میں میر حسن علی کی قرأت اور غفران وحذیفہ کی نعت سے تقریب کا آغاز ہوا۔ پروفیسر اقبال کے فرزند خرم، محمد عارف اور سلیم اس تقریب میں موجود تھے۔ مختار احمد فردین نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

(منصف، حیدرآباد)

میرے بعد

● دیوبند۔ 14 جون، انجمن فروغ ادب دیوبند کی جانب سے حضرت شیخ الہند ہال میں مرحوم شاعر عمر فاروق عاصم عثمانی کے مجموعۂ کلام ''میرے بعد'' کے اجرا کی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے حبیب صدیقی نے کہا کہ عمر فاروق عاصم کا یہ مجموعۂ کلام نئی نسلوں کے لیے ادبی میدان میں مشعل راہ ثابت ہوگا۔ ممبئی سے تشریف لائے ہوئے مہمان افضل عثمانی نے عمر فاروق عاصم کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ان سے آدھی صدی تک دیوبند کا ادبی ماحول فیضیاب ہوا۔ مولانا حسن الہاشمی نے فرمایا کہ ''میرا ادارہ آج بھی خدمت خلق میں مصروف ہے۔ لیکن عمر فاروق عاصم کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔''

قاری ابوالحسن اعظمی نے کہا ''فاروق عاصم شعر کہنے میں کسی خاص ماحول

کے محتاج نہیں تھے۔ زود گوئی ان کا خاص وصف تھا۔'' مولانا ندیم الواجدی قرآن وحدیث کے حوالے سے کہا کہ اچھی شاعری وہ ہے جس سے انسانیت کو فروغ ملے۔ عمر فاروق عاصم عثانی کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے مثبت پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ عاصم صاحب کے ایک شعر کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا نے کہا کہ اس طرح کی شاعری وہی شخص کرسکتا ہے کہ جو ذمے دارانہ رویہ رکھتا ہو۔ اور جو معاشرے میں تعمیری کردار ادا کرنے کا آرزومند ہو۔ دہلی سے تشریف لائے ہوئے مہمان خصوصی ڈاکٹر تابش مہدی نے کہا کہ'' عمر فاروق عاصم کی غزلوں کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ان میں زبان وبیان کی سادگی کے ساتھ بلا کی پرکاری اور تازہ کاری بھی ملتی ہے۔ زبان و بیان کی چاشنی اور لہجے کی متانت نے ان کی شاعری کو توانائی عطا کی ہے۔ چونکہ وہ ایک مومن شاعر تھے اس لیے ان کے ہاں ہمیں وہ بصیرت اور حکمت بھی ملتی ہے جسے ہم انقلاب آفریں شاعری کا حصہ کہہ سکتے ہیں۔'' پروفیسر حامد تحسین نے مرحوم سے اپنے قدیم مراسم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ عمر فاروق عاصم نے ادبی میدان میں بہت سے لوگوں کی بھرپور رہنمائی کی ان کا کتب خانہ عظیم بک ڈپو ادبی لوگوں کے لیے درس گاہ کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ تقریب اجرا کی نظامت مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے کی۔

اس موقع پر ایک مختصر ادبی نشست کا انعقاد بھی کیا گیا جس میں میرٹھ سے تشریف لائے جناب ڈاکٹر جمیل میرٹھی، سہارنپور سے آئے ہوئے جناب ڈاکٹر کمال، جناب افضل عثانی، جناب عمر دراز خاں عمر، جناب عبداللہ راہی، جناب عدیل تابش کرتپوری، جناب زبیر احمد زبیر، جناب ڈاکٹر عدنان انور نعمانی، عبدالرحمن سیف، ذکی ماہر، ہارون حسرت اور ڈاکٹر تابش مہدی صاحب نے بھی اپنا کلام پیش کیا۔ ادبی نشست کی صدارت ڈاکٹر تابش مہدی نے کی اور نظامت کے فرائض عبداللہ راہی نے انجام دیے۔ (اخبار مشرق، نئی دہلی)

بے چینی

● نئی دہلی۔ یکم جولائی۔ یہ افسانچوں کا دور ہے۔ بہت سے لوگ کچھ کہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کہہ پاتے اور بہت سے لوگ خاموش رہتے ہوئے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ممتاز ادیب جوگندر پال نے ڈاکٹر ایم اے حق کے افسانچوں کے مجموعے ''بے چینی'' کی رسم اجرا کی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ تقریب کا اہتمام ثریا پبلی کیشنز نے کیا تھا۔ مسٹر پال نے کہا کہ تیز رفتار دور میں لوگوں کے پاس داستان یا ناول پڑھنے کا وقت نہیں ہے اس لیے افسانچے وقت کی اہم ضرورت ہیں۔ مسٹر ایم اے حق کے افسانچے ذہن وضمیر کو جھنجوڑتے ہیں۔ کتاب کا اجرا ''کتھا دیش'' کے ایڈیٹر ہری نارائن جی نے کیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر جوائنٹ لیبر کمشنر پیوش شرما نے شرکت کی۔

تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ''بے چینی'' کے افسانچوں کے حوالے سے تقریر کی۔ ڈاکٹر فراز حامدی اور ڈاکٹر خالد حسین خاں نے بھی ایم اے حق کی تخلیقی قوتوں کا اعتراف کرتے ہوئے افسانچے کے سماجی اور سیاسی سروکار پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ تقریب کے اہم شرکا میں حقانی القاسمی، رضی احمد تنہا، عارف اقبال، بی ایس جین جوہر اور نعمان قیصر کے علاوہ سرکردہ ادیب وشاعر شامل تھے۔ (ہندوستان ایکسپریس، نئی دہلی)

کلیات نیاز گلبرگوی

● گلبرگہ۔ 6 جولائی، حضرت نیاز گلبرگوی، ارض گلبرگہ کے ایک اہم کلاسیکی شاعر ہیں۔ انھوں نے پاکستان منتقل ہونے کے باوجود اپنے وطن گلبرگہ سے اپنا لگاؤ باقی رکھا۔ وہ میر، غالب، مومن اور اقبال سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ ان کے اثرات بھی نیاز صاحب کی شاعری میں ملتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار جناب وہاب عندلیب نے 5 جولائی کی شب خواجہ بندہ نوازؒ ایوان اردو میں انجمن ترقی اردو شاخ گلبرگہ کے زیر اہتمام'' کلیات نیاز گلبرگوی'' کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ حضرت نیاز گلبرگوی اپنے فرزندان کی امریکہ منتقلی کے بعد خود بھی امریکہ منتقل ہوگئے ہیں۔ ان کی یہ دوسری ہجرت ہے۔ یہ بات ہمارے لیے مسرت بخش ہے کہ کہیں بھی رہیں، گلبرگہ سے اپنی وابستگی برقرار رکھتے ہیں۔

حضرت نیاز گلبرگوی نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ میں کہیں نہیں گیا، میں یہیں گلبرگہ میں ہوں، ایسا لگتا ہے کہ پاکستان کو بھی میں نے خواب میں دیکھا ہے اب امریکہ بھی خواب وخیال کی دنیا ہے۔ میں مستقلاً گلبرگہ ہی میں خود کو محسوس کرتا ہوں۔ انھوں نے 26 سال قبل اپنے پہلے مجموعۂ کلام'' حرف وفا'' کی گلبرگہ میں اشاعت اور رسم اجرا کی یادیں تازہ کرتے ہوئے کہا کہ جب پاکستان کے ممتاز ادیبوں نے'' حرف وفا'' کی رسم اجرا کی ریڈیو فلم دیکھی تو انھوں نے حیرت سے کہا کہ کیا گلبرگہ میں اتنے مخلص لوگ بستے ہیں۔ نیاز صاحب نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا کہ گلبرگہ کا دوسرا نام محبت ہے۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے عہدہ داران اور ارکان سے اپنی پذیرائی پر اظہار تشکر کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبدالحمید اکبر (صدر شعبۂ اردو فارسی گلبرگہ یونیورسٹی) پروفیسر حمید سہروردی (سابق صدر شعبۂ اردو فارسی گلبرگہ یونیورسٹی) نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروفیسر حمید سہروردی نے تقریب کی صدارت بھی کی۔ تقریب اجرا کا آغاز حضرت صابر شاہ آبادی مرحوم کی حمد سے ہوا۔ جسے ان کے فرزند الیاس صابری نے انہی کے انداز میں پیش کیا۔ صدر انجمن ترقی اردو گلبرگہ جناب ولی احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اور حضرت نیاز گلبرگوی کو شال اڑھائی۔ جناب حامد اکمل ایڈیٹر کے بی این ٹائمز کے علاوہ نیاز صاحب

کے رفیق خاص سید احمد حسین سحر قادری مرحوم کے فرزند جناب سید فاروق حسین قادری اور مولوی قاری عبدالعزیز صاحب اور نیاز صاحب کے ہمشیرزادہ امجد احمد خان نے نیاز صاحب کو شال اڑھا کر گلپوشی کی۔ جناب سراج وجیہہ شوراپور، جناب سید عبدالعلیم یادگیر، مرزا علی بیگ، جناب خواجہ پاشاہ انعامدار، جناب اکرم نقاش، جناب وحید انجم اور جناب غلام رسول، عبدالحکیم ساغر نے نیاز صاحب نے بھی مہمانوں کی گلپوشی کی۔ (ڈاک سے)

آدھی ساکھی کبیر کی

● سہارنپور۔ 22 جون۔ کملاپتی پانڈے کی تحقیقی کتاب ''آدھی ساکھی کبیر کی'' کا اجرا مقامی ہوٹل رائل ریزیڈنسی میں ہوا۔ اجرا کی رسم مشترکہ طور پر آر پی شکل، گریش پانڈے، شومورتی، کیدارناتھ سنگھ، کملیش بھٹ نے انجام دی۔ شمع، آر پی شکل نے روشن کی۔ کل شام ہوئے اس پروگرام میں صاحب کتاب کملاپتی پانڈے نے کہا کہ کبیر کے بارے میں کہی گئی بہت سی باتیں صحیح نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کبیر نے خود کو کہیں کبیر تو کہیں کبیرا کہیں کبیروا اور کہیں کبیرز کہا ہے۔ جہاں جیسی ضرورت ہوئی وہاں انھوں نے اپنے نام کو معمولی بدلا ہے۔ انھوں نے کبیر کو ان پڑھ ماننے سے انکار کیا۔ جواہر لال یونیورسٹی کے سابق پروفیسر کیدار ناتھ سنگھ نے کہا کہ کبیر کا لکھا گروگرنتھ میں بھی ملتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تمام طرح کے تنازعات کے باوجود کبیر اپنی تخلیقات میں زندہ رہیں گے۔ انھوں نے ایک کبیر مٹھ پر کبیر کے لکھے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے کا الزام لگاتے ہوئے کہا کہ کبیر نے جہاں جہاں بھی اللہ یا خدا کہا ہے اس کو نکال دیا گیا ہے اور اس کی جگہ دیوی دیوتاؤں کے نام لگائے جا رہے ہیں جو ایک المیہ ہے۔ ڈاکٹر این سنگھ نے کہا کہ کبیر کی تخلیقات آج بھی اتنی ہی گراں قدر ہیں جتنی پرانے زمانے میں تھیں۔ انھوں نے کہا کہ کبیر کا جہاں پیدا ہونا بتایا جاتا ہے وہاں دلت رہتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی ماں دلت ہو۔ شومورتی نے کہا کہ جب تک کبیر کا گہرائی اور ایمانداری سے مطالعہ نہیں کیا جائے گا ان پر تنقید یا تبصرہ کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ گریش پانڈے نے کہا کہ کبیر کی زندگی، ان کے حالات و واقعات سے سبق لینا ہوگا۔ آر پی شکل نے کہا کہ کبیر کے مختلف نام اور کام ہی انھیں بڑا بناتے ہیں۔ انھوں نے ''آدھی ساکھی کبیر کی'' کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس کتاب کا اجرا کرانے والی تنظیموں کو میں مبارکباد دیتا ہوں۔ انھوں نے کبیر کے خاندان کے بارے میں متنازعہ بیانات کو ایک طرف کرتے ہوئے کہا کہ سوال یہ ہے کہ کبیر تھا یا نہیں یہ طے شدہ ہے کہ کبیر تھا۔ تو اس کے بعد اور باتوں کی بحث بے معنی ہے۔ ڈاکٹر سریندر سنگھل نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی صدارت آر پی شکل نے اور کارروائی کملیش بھٹ اور ڈاکٹر ویریندر اعظم نے چلائی۔ (صحافت، نئی دہلی)

کرن کرن

● نئی دہلی۔ 14 جون، نئی نسل کے ایک شاعر جگنو چندر دیوی اپنے پہلے شعری مجموعے ''کرن کرن'' کے ساتھ بساط سخن پر وارد ہوئے ہیں۔ شباب للت اور مخمور سعیدی نے جگنو چندر دیوی کے مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان سے امیدیں وابستہ کی ہیں۔ 120 صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں 2 حمدیں، تین نعتیں، دو دعائیں شامل ہیں۔ ان کے بعد غزلیں ہیں۔ آخر میں فلمی گیت۔ (سالار، بنگلور)

وفیات

سید عبداللہ بخاری

● دہلی کی جامع مسجد کے سابق شاہی امام مولانا سید عبداللہ بخاری کا طویل علالت کے بعد 8 جولائی کی صبح نئی دہلی میں آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں انتقال ہوگیا ان کی عمر 87 برس تھی۔ مرحوم کے جسد خاکی کو بعد نماز عشا تقریباً ساڑھے دس بجے جامع مسجد کمپلیکس میں واقع ان کے آبائی قبرستان جنت نشاں میں سپرد خاک کردیا گیا۔ اس سے قبل تقریباً پونے دس بجے ان کے بڑے بیٹے اور موجودہ شاہی امام سید احمد بخاری نے جامع مسجد کے صحن میں نماز جنازہ پڑھائی۔ جنازے کی نماز میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ نماز کے بعد میت جامع مسجد کے شاہی دروازے سے باہر لائی گئی اور جامع مسجد چوک، اردو بازار، چاؤڑی بازار کی جانب سے ہوتے ہوئے گیٹ نمبر 3 باب الغفور سے جنت نشاں میں داخل ہوئی۔ مرحوم کے بیٹوں نے ان کے جسد خاکی کو قبر میں اتارا۔ پسماندگان میں موجودہ شاہی امام مولانا سید احمد بخاری سمیت چار بیٹے، دو بیٹیاں اور اہلیہ شامل ہیں۔

مولانا عبداللہ بخاری کا جسد خاکی دوپہر تقریباً 12 بجے ایمس سے جامع مسجد کمپلیکس میں واقع جنت نشاں میں لایا گیا جہاں موجودہ شاہی امام سید احمد بخاری، ان کے چھوٹے بھائی یحییٰ بخاری، طارق بخاری اور حسن بخاری کی موجودگی میں انھیں غسل دیا گیا۔ تب تک بہت بڑی تعداد میں لوگ وہاں پہنچ چکے تھے اور مولانا بخاری کے آخری دیدار کے لیے بے تاب تھے۔ سیاسی لوگوں میں سب سے پہلے تقریباً ساڑھے بارہ بجے مرکزی وزیر صحت غلام نبی آزاد جنت نشاں پہنچے۔ ان کے بعد ممبر پارلیمنٹ ظفر علی نقوی وہاں پہنچے۔ اس کے بعد مولانا بخاری کو خراج عقیدت پیش کرنے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ تقریباً ڈیڑھ بجے وزیر اعلیٰ شیلا دکشت اور وزیر صنعت ہارون یوسف ایک ساتھ پہنچے۔ ان کے علاوہ دہلی کے وزیر شہری ترقیات ڈاکٹر اے کے والیہ، جمعت

علمائے ہند کے رہنما اور ممبر پارلیمنٹ مولانا محمود مدنی، ڈاکٹر شفیق الرحمٰن برق، سجن کمار، دہلی پردیش کانگریس کے صدر جے پرکاش اگروال، ڈاکٹر فاروق عبداللہ، سابق مرکزی وزیر سردار بوٹا سنگھ، سردار رچھپال سنگھ، مٹیا محل کے ممبر اسمبلی شعیب اقبال، دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین چودھری متین احمد، میونسپل کونسلر محمود ضیا، سٹی زون کے چیئرمین عبید اقبال، وائس چیئرمین خرم اقبال، آصف محمد خان، مرزا صدیق علی، مرزا جاوید، مولانا عبدالوہاب خلجی، سابق ممبر پارلیمنٹ کشوری لال، اور بی جے پی کے لیڈر وجیندر گپتا وغیرہ نے پہنچ کر مولانا بخاری کو خراج عقیدت پیش کیا۔

تدفین کے وقت جو اہم شخصیات موجود تھیں ان میں وزیر صحت غلام نبی آزاد، وزیر مملکت سبودھ کانت سہائے، سابق مرکزی وزیر سید شاہنواز حسین، روزنامہ راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر عزیز برنی، محمد اعظم خاں، عمران قدوائی، کمال فاروقی، فتح پوری کے شاہی امام ڈاکٹر مفتی محمد مکرم احمد، شعیب دانش، جمال الدین انجینئر، آصف محمد خاں، صفدر ایچ خاں، مرزا صدیق علی، عبدالسمیع سلمانی، محمد طارق صدیقی، اکرم قادری، حاجی میاں فیاض الدین، راحت ابرار، حاجی اکرام حسین، مرزا جاوید علی، حافظ مطلوب کریم، راحت چودھری، خواجہ شاہد، حافظ جاوید، حاجی ریاض الدین، اطہر حسین دہلوی، حاجی جہانگیر اور حاجی قیام الدین سمیت بڑی تعداد میں مذہبی، سیاسی، سماجی، ملی اور عوامی شخصیات موجود تھیں۔ مولانا عبداللہ بخاری کے جسد خاکی کو عام لوگوں کے دیدار کے لیے عصر کی نماز کے بعد جامع مسجد کے صحن میں رکھا گیا جہاں ہزاروں افراد نے ان کا آخری دیدار کیا۔ اس دوران مسجد کے اندر بہت بڑی تعداد میں لوگ قرآن پڑھ کر مولانا بخاری کو ثواب پہنچاتے رہے۔ ان میں بہت بڑی تعداد خواتین کی بھی تھی۔ 27 سال تک شاہی امام کے منصب کے فرائض انجام دینے کے بعد مرحوم نے 14 اکتوبر 2000 کو عمائدین، علما، کعبہ شریف کے امام عبداللہ بن سبیل کے نمائندے محمد عبدالرحمٰن مرشد، متعدد ممالک کے سفرا کی موجودگی اور نمازیوں کے ایک عظیم اجتماع میں حسب روایت قدیم اپنے بیٹے مولانا سید احمد بخاری کو منصب امامت پر فائز کیا۔ شاہی امام کی حیثیت میں مولانا سید عبداللہ بخاری نے مختلف ممالک کا دورہ کیا اور متعدد سربراہان مملکت اور مذہبی رہنماؤں سے ملاقات کی۔ جن اہم لیڈروں سے ان کی ملاقات ہوئی ان میں ملک سعود بن عبدالعزیز، سعود بن فیصل بن عبدالعزیز، ملک عبداللہ بن عبدالعزیز، معمر قذافی، جمال عبدالناصر، جنرل ضیاء الحق، سابق صدر صدام حسین اور ایرانی انقلاب کے رہنما آیت اللہ خمینی شامل ہیں۔

صدر جمہوریہ ہند محترمہ پرتبھا دیوی سنگھ پاٹل نائب صدر جمہوریہ ہند جناب محمد حامد انصاری اور صدر کانگریس محترمہ سونیا گاندھی نے سابق شاہی امام کے سانحۂ ارتحال پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جامع مسجد دہلی اور ملک کی تاریخ میں ہمیشہ ان کا نام روشن رہے گا۔

مولوی عبدالسلام خاں

●13 اپریل 2009 کو رامپور میں مولوی عبدالسلام خاں کا انتقال ہوگیا۔ وہ 17 مارچ 1914 کو پیدا ہوئے۔ 1922 میں مدرسۂ عالیہ کے درجہ ہفتم میں داخلہ لیا اور 1930 میں سند فراغت حاصل کرلی۔ اس دوران عربی و فارسی بورڈ الہٰ آباد کے امتحان عالم اور فاضل ادب بھی پاس کرلیے اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور سے مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات بالترتیب 1931 اور 1933 میں پاس کیے۔ مولانا فضل حق رام پوری (متوفی 1940) سے علوم عقلیہ کی تکمیل کی اور سندِ عام حاصل کی۔ 1934 سے مدرسہ جامعتہ المعارف میں تدریسی خدمات کا آغاز کیا۔ 1944 میں مدرسہ عالیہ میں مدرس عربی کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ 1957 میں پرنسپل کے عہدے پر ترقی ہوئی۔ 30 جون 1975 کو ریٹائر ہوئے۔

عبدالسلام خاں نے تقریباً 50 علمی، ادبی اور تحقیقی مقالات لکھے۔ آپ کی مندرجہ ذیل کتب شائع ہوئیں۔

1. افکار ردی 1981
2. دیوان مصحفی کا رام پوری نسخہ 1980
3. افکار اقبال 1991
4. الفلسفتہ القدیمتہ الہندیہ (ہندوستانی مذاہب کا تجزیاتی مطالعہ) 1996
5. قواعد اردو
6. برصغیر کے علمائے معقولات اور ان کی تصنیفات 1996
7. مدرسہ عالیہ رام پور۔ ایک تاریخی درس گاہ 2002

1990 میں عربی زبان وادب کی مجموعی خدمات کے صلے میں انھیں صدر جمہوریۂ ہند نے قومی ایوارڈ سے نوازا۔ اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ نے 1997 میں اپنا سب سے بڑا ادبی اعزاز مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ عطا کیا۔ 1998 میں رضا لائبریری بورڈ کی جانب سے نواب فیض اللہ خاں ایوارڈ عطا کیا گیا۔

مولوی عبدالسلام خاں صاحب کا میدان فکر وخیال چونکہ ابتدا سے ہی منطق وفلسفہ رہا اس لیے وہ تادم آخر علم معقول کی کتب ومضامین کے مطالعے میں مشغول رہے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود پر ایک تحقیقی کتاب مکمل کرلیں لیکن وہ خواہش ادھوری رہ گئی۔

اوائل اپریل میں ان کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس کے باعث وہ

صاحب فراش ہوگئے تھے۔ 13 اپریل کو شام 6 بجے ان کا انتقال ہوا۔ اگلے روز دوپہر ایک بجے جامعتہ المعارف میں ان کی نماز جنازہ ہوئی اور مسجد گھیر مردان خاں کے قدیمی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

کاوش بدری

● 28 مئی 2009 کو اردو کے مشہور شاعر اور ادیب کاوش بدری کا طویل علالت کے بعد شہر آمبور میں انتقال ہوگیا۔ ان کی تکفین و تدفین اسی دن بعد نماز عشا کی گئی۔ وفات کے وقت ان کی عمر 80 سال تھی۔ کاوش بدری کا نام عبدالرزاق پاشاہ تھا اور انھیں قلندر دکن بھی کہا جاتا تھا۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے ایک بیٹی اور داماد ہیں۔

ملازمت کے سلسلے میں انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ شہر مدراس میں گزارا اور مدراس یونیورسٹی میں سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے سبکدوشی کے بعد وہ اپنے آبائی شہر آمبور چلے گئے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ ادیب اور نقاد بھی تھے۔ جناب رحیم احمد فاروقی آزار کے شاگرد تھے لیکن اب خود استادی کے مرتبے پر فائز تھے۔

کاوش بدری ہر صنف سخن پر قدرت رکھتے تھے غزل، نظم، رباعی، قطعہ، انھوں نے مثنوی کی صنف کو بھی عروج بخشا جس کی مثالیں ان کی تصانیف شردھانجلی، مثنوی قبلہ نما اور کاویم ہیں۔ حال ہی میں ان کی غزلوں کا انتخاب ''کن فیکون'' منظر عام پر آیا تھا۔ کاوش بدری تملناڈو اسٹیٹ اردو اکادمی کی پہلی گورننگ کونسل کے ممبر رہے تھے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں تملناڈو اسٹیٹ اردو اکادمی نے 2006 میں انھیں ''ڈاکٹر عبدالحق ایوارڈ برائے نمایاں اردو خدمات 2006 سے نوازا تھا جو ایک سندنامے، مومنٹو اور 25 ہزار روپیوں کے چیک پر مشتمل تھا۔

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی

● آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے سابق ڈائرکٹر اور رام پور رضا لائبریری کے سابق افسر بکار خاص ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی کا 8 جون کو 3.30 بجے لکھنؤ کے سہارا اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ برین ہیمرج حملہ ہونے کے بعد وہ کئی دن سے کوما میں تھے۔ انتقال کے وقت ان کے اہل خانہ اور رضا لائبریری کے کئی افراد اسپتال میں موجود تھے، موجودہ افسر بکار خاص پروفیسر شاہ عبدالسلام بھی لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔ مرحوم کی تدفین لکھنؤ کے نشاط گنج میں ہوئی۔

ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی 11 ستمبر 1934 کو موضع رسول پور، ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ ان کے والد ڈاکٹر مختار احمد صدیقی تحصیل گھوسی میں آنریری مجسٹریٹ تھے۔ ڈاکٹر صدیقی کی ابتدائی تعلیم ان کے چچا وکیل احمد صدیقی کے پاس لکھنؤ میں ہوئی۔

پروفیسر بدرالحسن عابدی

● عربی و فارسی کے مشہور اسکالر، اور عالم دین پروفیسر بدرالحسن عابدی کا 14 جون کی صبح بنارس میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر 86 برس تھی۔ مرحوم کے جسد خاکی کو رات میں ہی ان کے آبائی شہر فیض آباد لے جایا گیا جہاں اگلے دن کثیر مجمع کی موجودگی میں ان کے آبائی امام باڑے میں دفن کیا گیا۔ پروفیسر بدرالحسن عابدی معروف خطیب اور عالم دین تھے اور ان کی مجالس میں بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے۔ انھوں نے اردو فارسی اور عربی میں کئی کتابیں تحریر کیں پینتیس برس تک بنارس یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔

مرحوم کے پسماندگان میں چار بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ مجھلے بیٹے ڈاکٹر عین الحسن نہرو یونیورسٹی میں ایفرو ایشین اسٹڈیز کے شعبے میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ بڑے صاحبزادے شمس الحسن ہیں جو ایک زمانے میں قومی آواز میں صحافی تھے اور آج کل دوردرشن کے اردو خبرنامے میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ ایک صاحبزادے بنارس میں ہی ڈاکٹری کرتے ہیں اور چوتھے صاحبزادے دوبئی میں ملازم ہیں۔

رضا رام پوری

13 ● جون کو معروف شاعر و صحافی رضا رام پوری کا بھوپال میں انتقال ہوگیا۔ وہ 75 سال کے تھے۔ تقریباً 40 سال سے وہ مستقل طور پر بھوپال میں مقیم تھے، 1949 سے انھوں نے اپنی شاعری کی ابتدا کی اور خیال رام پوری سے اصلاح لینا شروع کی۔ یہ سلسلہ خیال صاحب کے مرحوم ہونے تک جاری رہا۔ 1960 میں وہ لکھنؤ چلے گئے، جہاں وحشی جونپوری کے ہمراہ ''قومی گزٹ'' نکالا اور کچھ دن بعد دہلی کے مختلف اخبارات میں کام کیا۔ 1966 میں وہ پھر رام پور آگئے، لیکن 1970 میں وہ اپنی سسرال بھوپال چلے گئے، جہاں مختلف اخبارات سے ان کا تعلق رہا۔ رضا رام پوری دربار رام پور کے عالمی شہرت یافتہ طبلہ نواز استاد احمد جان خاں تھرکوا کے بیٹے تھے۔ انھوں نے شاعری و موسیقی کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مراد آباد سے انھوں نے بی اے کیا۔ وہ غزل، مسدس، نعت و منقبت اور گیتوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ کچھ دن ممبئی سے بھی رابطہ رہا اور دو فلموں کے لیے ایک ایک گیت بھی لکھا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد 60 سے زیادہ ہے، جن میں منظر بھوپالی، ثروت زیدی، صبا پروین اور زاہد بھوپالی نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

□□□

تبصرہ وتعارف

کلیاتِ ولی

مرتب: نورالحسن ہاشمی

صفحات: 433، قیمت: -/148 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: احمد کفیل، E-122، برہم پتر ہاسٹل، جے. این. یو.، نئی دہلی-110067

''کلیاتِ ولی'' کا یہ نسخہ قومی اردو کونسل نے حال ہی میں شائع کیا ہے۔ یہ نسخہ پہلی بار اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے 1989 میں شائع ہوا تھا۔ لیکن اب بازار میں یہ نسخہ نایاب تھا، جدید تحقیق کی روشنی میں نظر ثانی کے بعد قومی اردو کونسل نے یہ نسخہ دوبارہ شائع کیا ہے۔

جدید تحقیق کی روشنی میں ''کلیاتِ ولی'' کے اس نسخے پر نظر ثانی پروفیسر نثار احمد فاروقی نے شروع کی تھی لیکن اس بیچ اچانک ان کا انتقال ہوگیا اور ان کے صاحبزادے نے اشاعت کے لیے مسودہ کونسل میں جمع کردیا۔ کونسل نے مسودے کو پروفیسر لئیق صلاح کے پاس ویٹنگ کے لیے بھیج دیا، جو دکنیات سے بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے اوّل تا آخر مسودے کا مطالعہ کیا، ضروری اصلاح کی اور اپنی جو رائے دی وہ ''حرفے چند'' کے تحت کلیات میں شامل کردی گئی ہے۔

''کلیاتِ ولی'' کی ''فہرست ترتیب'' کئی حصوں میں منقسم ہے۔ مرتب کلیات پروفیسر نورالحسن ہاشمی کا طویل ''دیباچہ'' اور ''مقدمہ'' ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا مضمون ''ولی کی زبان'' اور لئیق صلاح کی رائے ''حرفے چند'' ابتدائی 60 صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد ولی کا کلام ہے جس میں 404 غزلیں، 82 فردیات، 26 رباعیات، 9 مخمس، 3 مستزاد، 2 ترجیع بند، 6 قصائد، 2 مثنویات اور ایک قطعہ ''درفراقِ گجرات'' شامل ہیں۔ اصل متن کے علاوہ ''ضمیمہ الف'' اور ''ضمیمہ ب'' میں وہ غزلیں اور غزلوں کے مطلعے شامل ہیں جن کی تصدیق معتبر نسخوں سے ابھی تک نہیں ہو پائی ہے کہ آیا یہ غزلیں ولی کی ہی ہیں یا کسی اور کی کہی ہوئی ہیں۔ یہ غیر تصدیق شدہ اشعار اور غزلیں اس نسخے میں الگ سے ضمیمے میں اس لیے دی گئی ہیں کہ اگر ان کی تصدیق ہوگئی تو اصل متن میں شامل کرلی جائیں گی۔ لیکن یہ غزلیں ''کلیاتِ ولی'' طبع سوم، انجمن ترقی اردو کراچی کے اصل متن میں شامل ہیں اور ان میں دو غزلیں تو ایسی ہیں جو بعض یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی ولی کے نام سے شامل ہیں۔ ان دونوں غزلوں میں سے ایک کا مطلع اور ایک کا مقطع دیکھیے:

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں ترے نین، غزالاں سوں کہوں گا

دل ولی کا لے لیا دلّی نے چھین
جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

ان میں دوسرے شعر میں جو تحریف ہوئی ہے اس کی تحقیق سامنے آچکی ہے اور یہ بھی کہ یہ شعر ولی کا نہیں مضمون کا ہے۔

(کلیات ولی، نورالحسن ہاشمی، ص 32-31)

پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے اس کلیات کی تدوین وترتیب میں بہت محنت کی ہے۔ ولی کا کلام پہلی بار 1833 میں فرانسیسی مستشرق گارساں دی تاسی نے فرانسیسی مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا، زیر نظر نسخے کی ترتیب میں تمام اہم نسخوں سے استفادہ کیا گیا ہے جن میں ''کلیاتِ ولی'' (1927) مرتبہ: احسن مارہروی، ''انتخابِ سخن'' مرتبہ: حسرت موہانی، ''دیوان ولی'' انجمن ترقی اردو کراچی، ''دیوان ولی'' کتب خانہ قومی عجائب گھر کراچی، ''دیوان ولی'' کتب خانہ مولانا ناظم نقوی کراچی، ''دیوان ولی'' کتب خانہ ڈاکٹر قاضی فضل عظیم کراچی، ''دیوان ولی'' کتب خانہ معین الدین عقیل کراچی، مشفق خواجہ اور محمد اکرام چغتائی کی تحقیق کے علاوہ ''کلیاتِ ولی'' مخطوطہ 1120 ہجری، خدا بخش لائبریری، ''کلیاتِ ولی'' مخطوطہ 1125 ہجری، کتب خانہ سالار جنگ، نسخہ کتب خانہ دانش گاہ پنجاب لاہور جو ذخیرۂ شیرانی میں محفوظ ہے، نسخہ کتب خانہ جامع مسجد ممبئی، ''کلیات ولی'' نوشتہ 1125 ہجری، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، ''کلیاتِ ولی'' نوشتہ 1156 ہجری انڈیا آفس لندن وغیرہ کے علاوہ پروفیسر نورالحسن ہاشمی نے سورت، لکھنؤ اور پونا سے شائع ہونے والے نسخوں سے بھی استفادہ کیا اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کی رہنمائی میں اپنی اس تدوین کو انجام تک پہنچایا۔ پروفیسر معین الرحمٰن صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج لاہور نے 1996 میں ''کلیاتِ ولی'' کا ایک نسخہ مرتب کرکے الوقار پبلی کیشنز سے شائع کرایا اور اپنے اس کام کو اس وقت تک کی تحقیق کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ نسخہ پروفیسر نورالحسن ہاشمی کا ہی عکس ہے، یعنی اوّل تا آخر دونوں کے متن میں کوئی فرق نہیں۔ اس سے پہلے پروفیسر معین الرحمٰن یہی سلوک مخمور سعیدی کے ''ترجمۂ وتتبو'' کے ساتھ بھی کرچکے تھے۔

قومی اردو کونسل سے شائع شدہ ''کلیاتِ ولی'' کا یہ نسخہ عام قاری کے لیے بھی اور تحقیقی باریکیوں سے شغف رکھنے والوں کے لیے بھی یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ اس نسخے کے ''دیباچے'' اور ''مقدمے'' میں پروفیسر ہاشمی نے

کلیاتِ ولی کے دستیاب نسخوں کے علاوہ ولی کی شاعری، ان کی دیگر ادبی کاوشوں، نام ونسب، وطن، استاد، احباب، سیروسیاحت، سالِ وفات، مدفن ہر پہلو پر تحقیقی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا مضمون ''ولی کی زبان'' تاریخی پس منظر میں ولی کی شاعری کا لسانیاتی احاطہ کرتا ہے۔ اورنگ آباد اور دلّی کی زبان میں مماثلت اور مغائرت، ہم مخرج اور قریب المخرج الفاظ کو قافیہ بنانا اور اس کے حسن و قبح کا احاطہ کیا ہے۔ کلیات کے آخر کے 19 صفحات میں ولی کے کلام میں مستعمل ان الفاظ کی فرہنگ حروف تہجی کے اعتبار سے دی گئی ہے جو آج مطلق رائج نہیں یا کم رائج ہیں۔

اٹھارہ سوستاون کے راہ نما (سوانحی خاکے)

صفحات: 276، قیمت: -/340 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: نوشاد عالم، 268 سابرمتی ہاسٹل، جے. این. یو، نئی دہلی-67

کتاب پہلی جنگ آزادی کی ایک سو پچاسویں سالگرہ کے موقعے پر اشاعت پذیر کتابی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس میں پہلی جنگ آزادی کے جانبازوں کے سوانحی خاکے تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں۔ خاکوں کی تعداد سترہ ہے۔ جن سربرآوردہ ہستیوں کے خاکے کتاب میں درج ہیں وہ ہیں بہادر شاہ ظفر، شہزادہ فیروز شاہ، جنرل بخت خاں، رانی لکشمی بائی، نانا صاحب، عظیم اللہ خاں، تانتیا ٹوپے، مولوی لیاقت علی، بیگم حضرت محل، احمد اللہ شاہ، مولانا فضل حق خیرآبادی، خان بہادر خاں، مولوی سید قطب شاہ، محمود خاں روہیلہ، کنور سنگھ، طرہ باز خاں اور مولوی علاء الدین۔

کتاب کا دیباچہ جو چار صفحات پر مشتمل ہے پروفیسر محمد حسن کے قلم سے ہے اور نہایت پرمغز اور جامع ہے۔ پہلی جنگ آزادی کے حوالے سے کئی ایسے نکات کی طرف اشارے ملتے ہیں جن کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا۔ خواتین مجاہدین آزادی بیگم حضرت محل اور لکشمی بائی کی قائدانہ صلاحیتوں اور ان کی جانبازی و شجاعت اور حب الوطنی کے جذبے کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

پہلا سوانحی خاکہ جو بہادر شاہ ظفر کا ہے اسلم پرویز صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی داستان پر لکھنے کے لیے اسلم پرویز صاحب کا انتخاب بہت ہی موزوں تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے حوالے سے آپ کی محققانہ کوششوں سے کون واقف نہیں۔ خاکہ بہت معلوماتی اور تحقیقی نوعیت کا ہے۔ دوسرا خاکہ اقبال حسین کا تحریر کردہ ''جنرل بخت خاں'' ہے۔ پہلی جنگ آزادی کے سلسلے میں بخت خاں کا نام سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ انگریزوں کے خلاف دہلی اور اودھ میں انھوں نے جس حسن تدبیر اور شجاعت و جوانمردی کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہمارے یہاں کی درسی کتابوں میں پہلی جنگ آزادی کے اتنے اہم کردار کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ خاکہ وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

رانی لکشمی بائی (جھانسی کی رانی) کا خاکہ ظہیر علی کا تحریر کردہ ہے۔ پہلی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف وہ ایسی حوصلہ مندی سے لڑیں کہ ان کی شجاعت کا اعتراف دیگر انگریز مورخوں نے بھی کیا ہے جنھیں ان سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ ان انگریز مؤرخین میں Vinicent Smith کا نام بھی آتا ہے جو رانی لکشمی بائی کو پہلی جنگ آزادی کے رہنماؤں میں سب سے قابل رہنما تسلیم کرتا ہے۔ ظہیر علی ہی نے گوبند ڈھونڈو پنت عرف نانا صاحب کا خاکہ قلمبند کیا ہے۔ تاریخی حقائق کی بنیادوں پر استوار یہ خاکہ بہت جامع اور معلوماتی ہے۔ کانپور کے علاوہ بریلی اور گورکھپور جیسے اہم محاذوں پر نانا صاحب نے اپنے رفقا کے ساتھ مل کر انگریزی قبضہ وتسلط کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ ظہیر علی نے نانا صاحب کی محاذ آرائی کو تاریخی ترتیب کے ساتھ مربوط ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔ تانتیا ٹوپے کا خاکہ بھی ظہیر علی ہی نے لکھا ہے۔ ان کا اصلی نام چندر پانڈورنگ تھا۔ جب لارڈ ڈلہوزی کی رسوائے زمانہ پالیسی Policy of Lapses کے تحت نانا صاحب کو پیشوا باجی راؤ کا جانشین تسلیم کرنے کے مطالبے کو مسترد کردیا گیا اور ان کے وظیفے کا سلسلہ بھی منقطع کردیا گیا تو نانا صاحب کے ساتھ تانتیا ٹوپے بھی انگریزی سرکار کے دشمن ہوگئے۔ انھوں نے اپنی کوششوں اور حسن تدبیر سے کمپنی کی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کو اپنا ہمنوا بنالیا اور کانپور میں نانا صاحب کی خودمختاری کا اعلان کردیا۔ خاکے کے مطالعے سے جنگ آزادی میں ان کی خدمات کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور ان کی ایک مکمل تصویر ابھر کر نگاہوں کے سامنے آتی ہے۔ کتاب میں شامل اہم ترین خاکوں میں ایک خاکہ بیگم حضرت محل کا ہے جو اقبال حسین نے لکھا ہے۔ خاکہ طویل نہیں لیکن جامعیت کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے۔ خاکے کے خاتمے پر ماخذ کی فہرست سے اقبال حسین کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بیگم حضرت محل فوجی مہم میں ناکامی کے بعد انگریزوں کی ترغیبات کو ٹھکرا کر نیپال کی ترائی میں جاکر زندگی کے باقی دن گزارنا گوارا کیا لیکن جابرانہ بیرونی تسلط کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ اقبال حسین کا ہی تحریر کردہ ایک اور اہم خاکہ مولانا فضل حق خیرآبادی ہے۔ مولانا کو علم وعمل کی دولت ورثے میں ملی تھی۔ خود بھی شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرچکے تھے۔ انگریزوں کی ناانصافیوں اور ان کے غاصبانہ رویے کو دیکھ کر ان کے خلاف مولانا کے دل میں انتہائی نفرت بھر گئی تھی۔ چنانچہ مولانا نے اپنی تقریروں کے ذریعے لوگوں کو انگریزی تسلط کے خلاف جہاد کی دعوت دی جس کی پاداش میں انھیں انڈمان بھیجا گیا۔ وہاں قید

وبند کے زمانے میں انھوں نے دو کتابیں بھی تحریر کیں جن سے جنگ آزادی اور انڈمان میں قید لوگوں کے حالات کے سلسلے میں ہمیں بہت بنیادی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

کتاب میں کمپوزنگ کی کچھ غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ امید ہے کہ اگلے ایڈیشن میں انھیں درست کر لی جائے گا۔ طباعت بہت عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔

آؤ سمندر کی سیر کریں

مصنف: محمد شمس الحق

صفحات: 183، قیمت: -/20 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

مبصر: مرتضیٰ علی اطہر، 3520/2، دیپ نواس، منیرکا، نئی دہلی-110067

قومی کونسل کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اردو کی ادبی کتابوں کے ساتھ ساتھ سائنسی اور علمی موضوعات پر ایسی کتابوں کی اشاعت کی جائے جو اردو قارئین کو نئے انکشافات اور نئی دریافتوں سے باخبر کرسکیں۔ پیش نظر کتاب ''آؤ سمندر کی سیر کریں'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کتاب کے مصنف محمد شمس الحق نے سمندر سے متعلق تمام تر معلومات اس کتاب میں یکجا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔

یہ معلومات ایک عام قاری کے لیے دلچسپی کی حامل ہوگی کہ زمین کی سطح ہی کی طرح سمندر کے اندر بھی پہاڑوں، زیر آب میدانوں، طویل غاروں، معدنیات کے ذخیروں اور انواع واقسام کے نباتات وحیوانات کی ایک پوری دنیا آباد ہے۔ مصنف نے پانی کے اندر کی اس حسین دنیا کے تمام پہلوؤں سے متعلق مختصر مگر صائب معلومات فراہم کی ہے۔ یہ کتاب جہاں ایک طرف جغرافیہ سے تعلق رکھتی ہے وہیں دوسری طرف سائنس کی ایک اہم شق حیاتیات (Biology) کی حدوں کو بھی چھوتی ہے۔

کتاب کے ابتدائی حصے میں کرۂ آب سے متعلق بنیادی معلومات دی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ دنیا میں بحر وبر کی تقسیم اس طرح ہوئی ہے کہ سطح زمین کے 71 فیصد حصے پر پانی اور 29 فیصد حصے پر خشکی پھیلی ہوئی ہے۔ پانی کا اتنا بڑا ذخیرہ تین بڑے سمندروں: بحرالکاہل، بحراوقیانوس اور بحر ہند کے انضمام سے وجود میں آیا ہے۔ یہ تینوں مل کر آبی ذخائر کا 90 فیصد حصہ گھیرتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا سمندر بحرالکاہل ہے جو سطح زمین کے ایک تہائی حصے پر پھیلا ہوا ہے۔

اس کے بعد سمندر کے اندر کے جغرافیائی نظام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ زیر آب پہاڑیاں، آئس برگ، زیر آب میدان اور ان پر بننے والے آتش فشاں، سمندر کی گہرائیوں میں پوشیدہ معدنیات کے ذخائر وغیرہ سے متعلق تفصیلات آسان اور دلچسپ انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ ''سمندر اور آب وہوا'' کے عنوان کے تحت ہمارے ماحول اور فضا کو منظم رکھنے میں سمندروں کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز سمندروں میں بڑھتی آلودگی اور اس کے سبب ماحولیاتی نظام میں پیدا ہونے والی خرابیوں پر تشویش ظاہر کی گئی ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں سمندر کے گہرے پانی میں بسنے والے انواع واقسام کے چھوٹے بڑے جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے ہر ایک جاندار کے بارے میں کم سے کم الفاظ میں ضروری اور بنیادی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب میں بعض بے حد دلچسپ باتیں بھی ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر صفحہ 178 پر یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ ''براعظم آسٹریلیا کے مشرق میں واقع گریٹ بیریر ریف کے جنوب میں بحرالکاہل میں ایک زیر آب زولوجیکل پارک بنایا گیا ہے جس میں 400 اقسام کے شیوال، پولپ اور تقریباً 1500 اقسام کی مچھلیوں کی نسلیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ قسم قسم کے دیو قامت جانور اس پارک کی خصوصیات ہیں۔'' خشکی پر تو اس طرح کے پارکوں کو بنانے کا سلسلہ کافی عرصے سے جاری ہے لیکن زیر آب ''زولوجیکل پارک'' کی تشکیل ایک حیرت انگیز بات ہے، جو بحری علوم (Marine Geology) کی ترقی کا اشارہ بھی ہے۔

یہ کتاب بچوں کی تعلیمی ضرورت کے پیش نظر ترتیب دی گئی ہے لیکن دلچسپ معلومات اور سمندر کی پر پیچ زندگی کی پرتوں کو کھول کر کتاب کے صفحات پر رکھ دینے کے باعث عام قاری کی دلچسپی کا مرکز بننے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

انگریزی اصطلاحات کے اردو تراجم کے ساتھ ساتھ قوسین میں انگریزی الفاظ بھی دے دیے گئے ہیں تاکہ قارئین کو اصطلاحات کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو، بات کی وضاحت کے لیے جگہ جگہ نقشے، خاکے اور تصویریں دی گئی ہیں جن سے کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن تصاویر اور نقشوں کی طباعت صاف نہیں ہے۔ بعض تصویریں تو بالکل غیر واضح ہیں۔ اگر نقشے اور تصاویر رنگین ہوتے تو کتاب کی شکل اور اہمیت دونوں ہی میں اضافہ ہوتا۔ مجموعی طور پر قومی کونسل کی یہ پیش کش اردو قارئین خصوصاً اردو میڈیم طلبہ کے لیے ایک اہم تحفہ ہے۔

جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ

مصنف: ڈاکٹر مولا بخش

صفحات: 280، قیمت: -/250 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی-110006

مبصر: ڈاکٹر شہزاد انجم، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-110025

''جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ'' ڈاکٹر مولا بخش کی پہلی مستقل تصنیف ہے۔ اس کتاب سے قبل ان کے متعدد تنقیدی مضامین ملک کے رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں جن کے مطالعے کے بعد ان کی فہم وفراست اور ذہانت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کے مقدمے ''یہ کتاب کیوں؟''

میں ڈاکٹر مولا بخش لکھتے ہیں:

''جدید ادبی تھیوری کی تفہیم پر مبنی یہ کتاب فلسفۂ ادب میں نئی پیش رفت کو اپنے طور پر سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے۔ ہندوستانی ادبیات میں اس بحث کو قائم کرنے میں اولیت گوپی چند نارنگ کو حاصل ہے، اس لیے اس کتاب کی ساری بحثوں میں گوپی چند نارنگ کو مرکزیت حاصل ہے۔''

کتاب میں چھ ابواب ''ادبی صورت حال''، تھیوری اور اس کا اطلاق''، ''مابعد جدید تنقید کی اہم ترجیحات''، ''ثقافتی مطالعات''، ''نثر نارنگ کی اسلوبی منطق'' اور ''معترضین نارنگ پر ایک نظر'' کے تحت جدید ادبی تھیوری کے اصول ونظریات سے بحث کی گئی ہے۔ پچاس سے زائد صفحے کے مقدمے ''یہ کتاب کیوں؟'' میں مختلف ناقدین کے نظریات و افکار کے حوالے سے جدید ادبی تھیوری پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

''جدید ادبی تھیوری اور گوپی چند نارنگ'' ہر چند کہ اپنے نام سے ایک نقاد پر باضابطہ کتاب لکھنے کا تاثر فراہم کرتی ہے لیکن کتاب کا مطالعہ کرنے پر یہ منکشف ہوتا ہے کہ یہ کتاب دراصل نارنگ کے حوالے سے ادبی تھیوری اور تھیوری کے مباحث پر ہے۔ جس میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے تنقیدی نظریات وافکار سے اس طرح بحث کی گئی ہے کہ قاری ادبی نظریات کے نئے او رپرانے اسالیب سے کماحقہ آگاہ ہو جاتا ہے۔ اب جو تھیوری آئی ہے جس کا مقصد تنقید میں بین العلومی طریقۂ کار سے کام لینا اور ادعائیت سے گریز کرنا، شامل ہے، اس سے متعلق تمام شقوں مثلاً ردتشکیل، ثقافتی مطالعات اور ان کا اطلاق، مصنف کی موت کا نظریہ وغیرہ جیسے بہت سے مسائل کو مصنف نے پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ تھیوری کے گہرے مسائل کو انتہائی آسان زبان میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ کہیں کہیں خندۂ زیر لبی اور کہیں کہیں مزاح کا ایسا انداز ہے کہ قاری کتاب سے خود کو الگ نہیں کر پاتا۔ مولا بخش نے اپنے مباحث کے لیے بعض نئی ترکیبیں بھی وضع کی ہیں اور کچھ نئی اصطلاحیں بھی خلق کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بنیادی طور پر اسلوبیاتی مطالعے کا ذہن رکھتے ہیں جس کا فائدہ انھوں نے اپنی نثر نگاری میں اٹھایا ہے۔ انھوں نے نثر نارنگ کی اسلوبی منطق پر جو اپنی رائے پیش کی ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔ اس باب کو پڑھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر نارنگ محض اپنی معلومات کی وجہ سے بڑے نقاد نہیں بنے بلکہ ان کے پاس دلکش نثر نگاری کا مجرب نسخہ بھی ہے۔

اس کتاب کا ایک اہم باب ''ثقافتی مطالعات'' ہے۔ مولا بخش نے ثقافتی مطالعے کے روایتی طرز اور ثقافتی مطالعے کے غیر روایتی طرز دونوں کے فرق پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر نارنگ کو جدید ثقافتی مطالعے کا بنیادگزار قرار دیا ہے اور ثقافتی مطالعے کے ضمن میں جتنے بھی نام ہو سکتے ہیں ان تمام نقادوں کے کارناموں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہے۔ کتاب کے اخیر میں معترضین نارنگ پر پورا باب ہے۔ پہلی نظر میں محسوس ہوتا ہے کہ یہ باب پروفیسر گوپی چند نارنگ سے اختلافات کرنے والوں کے حوالے سے جذباتی قسم کا ردعمل ہوگا لیکن مولا بخش نے شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی، فضیل جعفری، ڈاکٹر بیج ناتھ، طارق سعید اور شاہد بھنڈر کے اعتراضات کا جواب تھیوری کے گہرے مباحث کو سامنے رکھتے ہوئے دیا ہے، اس سنجیدگی کے ساتھ کہ کوئی شخص بھی انھیں جانب دار قرار نہیں دے سکتا۔ کہیں کہیں مولا بخش کی فقرہ بازی قاری کو مزہ دے جاتی ہے۔

اس کتاب میں نہ صرف گوپی چند نارنگ کے کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ نئی نسل میں تخلیقی فنکاروں اور نقادوں کی ایک ایسی تعداد سامنے آگئی ہے جو جدیدیت کو از کار رفتہ سمجھتی ہے اور مابعد جدیدیت کا استقبال کرتی ہے۔

جستجو (تنقیدی تحقیقی مضامین)

مصنف: ڈاکٹر محمد ریاض الدین خاں

صفحات: 320، قیمت: -/130 روپے

ناشر: انیس کتاب گھر، میر عالم خاں مینشن، میر گنج، ٹونک - 304001

مبصر: ارشد علی خاں، معرفت موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9۔ گولہ مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی - 110002

اس کتاب میں کل پندرہ مضامین شامل ہیں جنھیں دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کے تحت دس مضامین دیے گئے ہیں جو فارسی مخطوطات پر ہیں۔ دوسرا حصہ ''مخطوطات و دیگر ماخذ'' پانچ مقالات پر مشتمل ہے۔

حصۂ اول کے پہلے دو مضامین رائے چترمن کایستھ کی فارسی تصنیف ''چہار گلشن'' (اخبار الفواد) پر ہیں۔ یہ ایک ضخیم اور قدیم تاریخ ہے۔ جس میں عہد سلاطین کے حالات، صوبوں کی تفصیلات اور درویشوں کے حالات شرح و بسط سے درج کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر ریاض الدین خاں نے بڑی باریک بینی سے کتاب کے مندرجات کا تجزیہ کیا ہے۔

اس حصے کے اگلے پانچ مضامین ہیں: فارسی مخطوطہ امیر نامہ کی روشنی میں قومی ایکتا، آزادی کا شہباز امیر خاں، نامساعد حالات کا شکار، امیر خاں افغانی النسل تھے پنڈاری نہیں، ایک یادگار شخصیت منشی بساون لال شاداں اور امیر نامہ — مورخین، مصنفین اور ہندی مترجم کی نظر میں۔ پانچوں مضامین بانی ریاست ٹونک نواب امیر الدولہ کے حالات زندگی، ان کی مہمات، ان کے شب و روز کے حالات کی تفصیل پیش کرنے کے ساتھ ان کی شخصیت کو غلط تصورات کے دائرے سے باہر نکالنے کی سعی وکاوش ہیں۔

اگلے تین مضامین ہیں: خلاصۃ التواریخ: تاریخ ہند کا ایک اہم مخطوطہ، خلاصۃ التواریخ: ایک تنقیدی جائزہ اور خلاصۃ التواریخ: مترجم کی نظر میں۔

''خلاصۃ التواریخ'' قدیم ہندوستان کی تاریخ پر مشتمل مخطوطہ ہے جس کے مصنف سجان رائے بھنڈاری ہیں۔ اس تاریخ کے چار الگ الگ مخطوطے ٹونک کے عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں موجود ہیں جن کا تقابل ڈاکٹر ریاض الدین نے باریک بینی سے کیا ہے اور ہر مخطوطے کی تفصیلی کیفیات بھی درج کی ہیں۔ ''امیر نامہ''، اور ''خلاصۃ التواریخ'' کو ریاض الدین خاں نے فارسی سے اردو اور ہندی میں منتقل بھی کرلیا ہے۔ ''امیر نامہ'' کا ہندی روپ انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہو چکا ہے اور ''خلاصۃ التواریخ'' کا ہندی ترجمہ وہاں داخل ہے۔ اردو روپ اشاعت کے مرحلے میں ہے۔

دوسرے حصے کے پانچ مضامین میں ''فنِ طب کا گوہر شب چراغ''، ''ثقافت کا مینارۂ نواب: سید منظور الحسن برکاتی، دربار اکبری میں راجستھان کے چار رتن: عبدالرحیم خانخاناں، مخطوطہ برج نامہ (مولفہ محمد عمر فصیح الوری دہلوی) اور عربی فارسی کے تحقیقی مرکز میں اردو زبان وادب کا فروغ شامل ہیں ان میں شروع کے چار مضامین شخصیات پر ہیں۔ پہلا مقالہ بانی دارالعلوم خلیلیہ ٹونک حکیم مولانا برکات احمد مرحوم کی شخصیت سے متعارف کراتا ہے۔ دوسرا مقالہ انھی حکیم صاحب کے خانوادے کے نامور ادیب مولانا سید منظور الحسن برکاتی کی شخصیت اور ان کی علمی وادبی کارناموں کا احاطہ کرتا ہے۔ تیسرے اور چوتھے مقالے تاریخی نوعیت کے ہیں جن میں مصنف نے عہدِ اکبری کے تعلق سے نئے پہلو تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے ڈاکٹر ریاض الدین خاں کی وابستگی طویل مدت تک رہی ہے جہاں انھیں انسٹی ٹیوٹ میں موجود نادرو نایاب مخطوطات ومطبوعات کو بہت قریب سے دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس کتاب کا انتساب انھوں نے اسی ادارے کے نام ان لفظوں میں کیا ہے:

''میں اپنی یہ تصنیف حکومتِ راجستھان کے قائم کردہ بین الاقوامی شہرت کے ادارے مولانا ابوالکلام آزاد عربی فارسی انسٹی ٹیوٹ راجستھان، ٹونک کے نام معنون کررہا ہوں جہاں میں نے تحریر وتقریر اور تحقیق وتنقید کا درس لیا۔''

ڈاکٹر محمد ریاض الدین خاں کی خدمات کا اعتراف بڑے پیمانے پر ہوا ہے اور انھیں متعدد اعزازات و ایوارڈ حاصل ہو چکے ہیں جن میں راشٹر پتی لاریٹ ایوارڈ بھی شامل ہے۔

□□□

بدھ کی کہانیاں

مصنف: انیتا کھنہ

بودھ مذہب کے بانی مہاتما بدھ ایک عظیم انسان تھے جنھوں نے اپنی زندگی کو عملی نمونہ بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا۔
انھوں نے ستیہ اور اہنسا کے اصولوں پر بے حد زور دیا اور ہر ذی روح کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے ساتھ پیش آنے کا درس دیا۔
کہانیوں کی یہ کتاب گوتم بدھ کی زندگی کے واقعات سے ترتیب دی گئی ہے۔

صفحات: 80، قیمت -/65 روپے

تینالی رمن کی کہانیاں

مصنف: سی. ایل. ایل. جیاپردا، مترجم: نامی انصاری

شمالی ہند میں جس طرح بیربل کی حاضر جوابی اور ذہانت کی کہانیاں مشہور ہیں اسی طرح جنوبی ہند میں تینالی رمن کی کہانیاں زباں زد عام ہیں۔ وہ اپنی غیر معمولی ظرافت، عقل مندی، رحم دلی اور خوش تدبیری کے باعث وجے نگر کے راجا کرشن دیورائے کا درباری شاعر بن گیا تھا اور کئی موقعوں پر اس نے راجا کی مشکلیں آسان کیں۔ اس کتاب میں ایسے ہی کچھ دلچسپ واقعات درج کیے گئے ہیں۔

صفحات: 72، قیمت -/60 روپے

محمد عبداللطیف

گیان پیٹھ انعام اور اردو ادیب

انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والی شخصیتوں کو سرکاری و غیر سرکاری ادارے مختلف قسم کے انعامات و اعزازات سے نوازتے ہیں۔ اس کا مقصد ان کی خدمات کا اعتراف کرنا ہوتا ہے۔

ادب کے میدان میں کسی تخلیق کار کے لیے ''گیان پیٹھ انعام'' کا حاصل کرنا ایک اعزاز ہے۔ یہ انعام ہر سال حکومتِ ہند کی منظور شدہ اٹھارہ زبانوں کے ادب میں شائع شدہ تخلیقی کتابوں میں سب سے نمایاں اور معیاری کتاب کے مصنف کو عطا کیا جاتا ہے۔

اس انعام کا اہتمام گیان پیٹھ نامی دلّی کا ایک ادارہ کرتا ہے۔ اس ادارے کا قیام 1944 میں عمل میں آیا تھا۔ مگر انعامات کا آغاز 1965 سے ہوا۔ 1965 سے یہ انعام ہر سال پابندی سے دیا جا رہا ہے۔ یہ انعام نہ صرف انعام یافتہ ادیب بلکہ اس زبان کے لیے بھی باعثِ افتخار ہوتا ہے جسے اس انعام سے نوازا جاتا ہے۔

گیان پیٹھ انعام کے لیے کتاب کا انتخاب کرنے کے لیے ایک کمیٹی ہوتی ہے جو تمام تسلیم شدہ زبانوں میں شائع شدہ تخلیقی کتابوں کا جائزہ لینے کے بعد کسی ایک کتاب کا انتخاب کرتی ہے۔ کتاب کا انتخاب کرتے وقت اس ادیب و شاعر کی مجموعی ادبی خدمات بھی پیش نظر ہوتی ہیں۔ انعام کی شرائط یہ ہیں:

1. ادیب یا شاعر کا ہندوستانی ہونا ضروری ہے۔

2. ادیب یا شاعر کا زندہ ہونا ضروری ہے۔

3. کسی زبان کے ادیب یا شاعر کو یہ انعام مل چکا ہے تو اگلے تین سال تک اس زبان کی کوئی دوسری کتاب اس مقابلے میں شریک نہیں ہوسکتی۔

4. یہ انعام کسی ادیب یا شاعر کو صرف ایک دفعہ دیا جاتا ہے۔

اس انعام میں انعام یافتہ ادیب یا شاعر کو سرسوتی دیوی کا ایک مجسمہ، سپاس نامہ، اور پانچ لاکھ روپے دیے جاتے ہیں۔

پہلا گیان پیٹھ انعام ملیالم زبان کے مہاکوی گوونداشنکر کروپ کو ملا۔ ملیالم کے علاوہ بنگالی، گجراتی، کنڑا، ہندی، اردو، تیلگو، اڑیا، مراٹھی، تمل، آسامی اور پنجابی وغیرہ زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی اس انعام سے نوازا گیا ہے۔ آیئے اب ہم اردو کی ان شخصیتوں کا ذکر کریں جنھیں اس انعام سے سرفراز کیا گیا ہے۔

فراق گورکھپوری: فراق اردو ادب کا پہلا ایسا نام ہے جنھیں گیان پیٹھ انعام سے نوازا گیا۔ انھیں 1969 میں ان کی شعری تصنیف ''گل نغمہ'' پر دیا گیا۔

فراق کا اصل نام رگھوپتی سہائے، تخلص فراق تھا۔ 28 اگست 1896 میں گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد سے حاصل کی۔ والد منشی گورکھ پرشاد پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے، شاعری بھی کرتے تھے اور عبرت تخلص کرتے تھے۔ بی۔اے۔ کی ڈگری

الہٰ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم.اے. کیا۔انھوں نے تحریک آزادی میں بھی حصہ لیا اور جیل بھی گئے۔

فراق بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں نغمگی، ترنم اور موسیقیت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے ہم عصروں میں نئی غزل کے پیش رونظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں اور رباعیوں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کا رنگ جھلکتا ہے۔ فراق کا شمار اردو کے تاثراتی نقادوں میں بھی ہوتا ہے۔ شعری مجموعے روحِ کائنات، مشعل، رمز وکنایات، گل بانگ، گل نغمہ، شبستاں، شعلۂ ساز، دھرتی کی کروٹ، چراغاں، شعرستان اور رباعیوں کا مجموعہ ''روپ'' وغیرہ کافی اہم ہیں۔ ''اندازے'' اور ''اردو کی عشقیہ شاعری'' ان کی نثری تصانیف ہیں۔

فراق کو گیان پیٹھ انعام کے علاوہ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، غالب ایوارڈ اور پدم بھوشن جیسے اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ آگرہ یونیورسٹی نے انھیں ڈی.لٹ کی اعزازی ڈگری سے بھی سرفراز کیا۔

فراق کی وفات 3 مارچ 1982 کو ہوئی۔

قرۃ العین حیدر: اردو کی دوسری گیان پیٹھ انعام پانے والی شخصیت ہیں۔ انھیں یہ انعام ان کے ناول '' آگ کا دریا'' پر 1989 میں دیا گیا۔

قرۃ العین حیدر کی ولادت 20 جنوری 1927 کو علی گڑھ، اتر پردیش میں ہوئی۔ والد سید سجاد حیدر یلدرم مشہور افسانہ نگار تھے۔ والدہ کا نام نذر سجاد حیدر تھا۔ ابتدائی تعلیم دہرہ دون میں حاصل کی۔ پھر لکھنؤ کے مشہور کالج ازابیلا تھوبرن میں داخلہ لیا اور لکھنؤ یونیورسٹی سے 1947 میں ایم.اے. انگریزی کی ڈگری حاصل کی۔

قرۃ العین حیدر نے افسانہ، ناول، تراجم، صحافت اور رپورتاژ نگاری وغیرہ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ مگر ان کی شہرت ان کے ناولوں کی وجہ سے ہے۔ ان کی تکنیک اور اسلوب کی وجہ سے انھیں اردو کی ورجینا وولف کہا جاتا ہے۔ انھوں نے '' آگ کا دریا'' میں شعور کی رو کی تکنیک اپنا کر۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ کو پیش کیا ہے۔ ان کے دوسرے ناولوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں ان میں اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب، گزرتے وقت کے ساتھ بدلتے حالات، تقسیم ہند کے بعد پیدا شدہ معاشی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی مسائل، مغربی تہذیب کے اثرات اور ہندوستانی مسلم نوجوانوں کے ذہنی انتشار جیسے موضوعات دکھائی دیتے ہیں۔ ''میرے بھی صنم خانے'' (1949) ''سفینۂ غمِ دل'' (1952) '' آگ کا دریا'' (1959) '' آخر شب کے ہم سفر'' (1971) ''کارِ جہاں دراز ہے'' (1990) ''گردشِ رنگِ چمن'' (1988)، ''چاندنی بیگم'' (1989) ''شاہراہ حریر'' (2002) ان کے اہم ناول ہیں۔ ''ستاروں سے آگے'' (1947) ''شیشے کے گھر'' (1954) ''پت جھڑ کی آواز'' (1966) ''روشنی کی رفتار (1982) ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ ''سیتا ہرن''، ''چائے کے باغ''، ''ہاؤسنگ سوسائٹی''، ''دل ربا'' اور ''اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو'' جیسے ناولٹ بھی ان کے تخلیق کردہ ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے ناول نویسی اور افسانہ نگاری کے علاوہ رپورتاژ نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ انھوں نے کل گیارہ رپورتاژ لکھے ہیں۔ ستمبر کا چاند، لندن لیٹر، کوہِ دماوند، جہانِ دیگر، خضر سوچتا ہے، وولر کے کنارے، دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں، پدماندی

کے کنارے، ان کے قابل ذکر رپورتاژ ہیں۔ انھوں نے انگریزی سے اردو، اور اردو سے انگریزی زبان میں کئی ترجمے کیے۔ ایلس ان ونڈر لینڈ، تین جاپانی، رات کی بات، آدمی کا مقدر، کلیسا میں قتل وغیرہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیے۔ دی ناچ گرل (حسن شاہ کا ناول، ڈانسنگ گرل (حسن شاہ کی خودنوشت سوانح)، اقبال کی نظم ''نیا شوالہ'' وغیرہ کو اردو سے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کا بھی انگریزی زبان میں ترجمہ کیا۔

قرۃ العین حیدر مختلف اخبارات و رسائل اور اداروں سے بھی وابستہ رہیں۔ انگریزی کے مشہور رسالے ''امپرنٹ'' ممبئی کی کیریئر ایڈیٹر کی حیثیت سے 68-1964 کے درمیان خدمات انجام دیں۔ 75-1968 کے درمیان انگریزی ہفتہ وار ''السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'' کی مدیر معاون رہیں۔

قرۃ العین حیدر کو گیان پیٹھ انعام کے علاوہ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ (1967)، سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ (1969)، پدم شری ایوارڈ (1984)، غالب ایوارڈ (1984)، اقبال سمان (1988) کے علاوہ دیگر کئی انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ محترمہ قرۃ العین حیدر نے 21 اگست 2007 کو دلّی میں وفات پائی۔

علی سردار جعفری: اردو کے تیسرے ادیب ہیں جنھیں 1997 میں گیان پیٹھ انعام سے نوازا گیا۔ علی سردار جعفری کی ولادت 29 نومبر 1913 کو بلرام پور، ضلع گونڈہ، اترپردیش میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ بی.اے. کی ڈگری دہلی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ پہنچے۔

سردار جعفری کا ادبی سفر افسانہ نگاری سے شروع ہوا اور ان کا افسانوی مجموعہ ''منزل'' 1938 میں شائع ہوا۔ لیکن ان کی شہرت کا باعث ان کی انقلابی اور اشتراکی شاعری بالخصوص انھیں آزاد نظم کہنے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کی نظموں کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، مختصر اور طویل۔ جن میں ان کی طویل نظمیں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی نظموں میں ''نئی دنیا کو سلام'' اس کی بہترین مثال ہے جس میں انھوں نے علامتوں کا سہارا لے کر سماج پر گہرا طنز کیا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں روزمرّہ کے مسائل، کشمکشِ حیات اور انسانی امنگوں کی بہترین عکاسی کی ہے۔

سردار جعفری کی نظموں میں انقلاب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ انقلاب، زیردستوں کی آزادی کی خواہش، طبقاتی کشمکش اور عوامی مسائل کا بیان ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔ ''پرواز''، ''نئی دنیا کو سلام''، ''خون کی لکیر''، ''ایشیا جاگ اٹھا''، ''پتھر کی دیوار''، ''ایک خواب اور''، ''پیراہن شرر'' اور ''لہو پکارتا ہے'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعوں میں ''ترقی پسند تحریک کی نصف صدی''، ''پیغمبرانِ سخن'' اور ''اقبال شناسی'' کافی اہم ہیں۔ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے ہیں، رپورتاژ اور صحافت میں بھی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔

سردار جعفری کو گیان پیٹھ انعام کے علاوہ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ، پدم شری، اقبال سمان اور مخدوم ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ان کے علمی و ادبی سفر کا اختتام 1 اگست 2000 کو ممبئی میں ان کی وفات کے ساتھ ہوا۔ □□□

پتہ: H.No. 6-17, Deshmukh Street, Basavakalyan, Dist Bidar, Karnataka-585327

عبدالرشید اعظمی

میں اردو ہوں

بچو! مجھے پہچانو! میں کون ہوں۔ میں کب پیدا ہوئی، کہاں پیدا ہوئی یعنی میری تاریخ پیدائش کیا ہے اور جائے پیدائش کیا ہے؟ مجھے معلوم نہیں۔ اس لیے میرا کبھی جشنِ پیدائش نہیں منایا گیا۔ میری تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کا سراغ پانے کے لیے صدیوں سے میرے چاہنے والے سرگرداں ہیں۔ میں نے اس برصغیر میں جس کا نام ہندوستان ہے کب اور کس ماں کے بطن سے جنم لیا، لوگ سالہا سال سے اسی تجسس میں ہیں۔ لوگ شہروں شہروں، بازاروں بازاروں اور گلیوں گلیوں مجھے ساتھ لیے پھرتے رہے، میں پروان چڑھتی رہی، نکھرتی رہی۔ پچھلے لوگ ساتھ چھوڑتے گئے، نئے لوگ ساتھ آتے گئے۔

تم حیران نہ ہوتا اگر میں کہوں کہ مجھے شہنشاہوں نے چاہا اور اپنے درباروں کی زینت بنایا۔ بہمنیوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ بیجاپور میں عادل شاہیوں نے آنکھوں کا سرمہ بنایا۔ گولکنڈے میں قطب شاہیوں نے مثلِ حنا ہاتھوں پر رچایا۔ دلی کے مغل دربار نے میری آؤ بھگت کی۔ درباروں سے باہر صوفیوں اور سنتوں نے گیان دھیان کی قبا پہنائی۔ تاجروں اور مبلغوں نے تہذیب وتمدن کی مورتی بنا کر جگہ جگہ نصب کیا۔ میرے سر پر ان سب کی چھتر چھایا رہی ہے۔

میں نے آبِ حیات پیا ہے، مجھے فنا سے نجات مل چکی ہے۔ میری ذات سے عداوت کرنے کا مآل میری ترقی اور عروج ہے۔ امتدادِ زمانہ سے میں شستہ وشگفتہ ہوتی ہوں۔ آنسو بہانے سے میری آنکھوں کی روشنی بڑھتی ہے۔ عقل وخرد کی کھڑکی کھلتی ہے۔ دل کے مقفل دروازے وا ہو جاتے ہیں۔ خسرو، نصرتی، ولی، میر، سودا، غالب، مومن، اقبال، ظفر، دیاشنکر نسیم، برج نرائن چکبست، رگھوپتی سہائے فراق اور آنند نرائن ملاّ کو میں نے عمر خضر عطا کی ہے۔ میری زلفیں سنوارنے والے، میری قبا میں لعل وجواہر ٹانکنے والے باوقار و باعزت اور سرخرو گزرے ہیں۔

مجھے مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے پکارا گیا۔ کبھی ہندوی تو کبھی ریختہ، کبھی ریختہ تو کبھی اردو، کبھی اردو تو کبھی ہندوستانی۔ میرا مولد کسی نے سندھ بتایا تو کسی نے دکن و دولت آباد، کسی نے دلی ونواحِ دلی تو کسی نے پنجاب، سنتے سنتے مجھے ان سبھی علاقوں سے محبت ہوگئی اور میں ہر جگہ رچ بس گئی۔ سب کے دلوں کو اپنا گھر بنالیا۔ ہر جگہ کی زبانوں اور بولیوں کو اپنے سینے میں بسا لیا۔ مجھے بدیسی کہنے والے وہ دیس نہیں بتاتے جہاں سے میں آئی ہوں۔ میں کہیں باہر سے نہیں آئی، میں ہندوستان کی مٹی سے پیدا ہوئی اور یہی سرزمین میرا مسکن و مامن بنی۔ بلا تفریقِ مذہب وملت ہر قوم ہر ذات اور ہر نسل کے لوگوں نے مجھ سے پیار کیا اور میں نے ان سے۔ شاہی درباروں اور خانقاہوں سے نکل کر میں دربدر نہیں ہوئی۔ مدرسے، کالج، یونیورسٹیاں، اکادمیاں میری پناہ گاہ بن گئیں۔ فلموں کے نغموں اور مکالموں کی زبان سے میں بولتی ہوں۔ چھاپہ خانوں اور پریسوں میں میری آواز گونجتی ہے۔ کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے صفحات پر میں نظر آتی ہوں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر میں سنائی دیتی ہوں۔ میں تقاریر وخطبات پر قانع نہیں، میں لکھنے والوں کے دست وقلم کو قوت دیتی ہوں۔ ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتی ہوں۔ میں ان کی روزی روٹی کی بھی ضامن ہوں۔ میں ہندوستان کی وہ زبان ہوں جس کا دائرۂ اثر اب

مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک دنیا میں ہر جگہ پھیل رہا ہے۔ دور دور تک میری رسائی ہو چکی ہے اور ہو رہی ہے۔ میرے ایک والہ و شیدا شاعر داغ دہلوی نے میرے لیے کبھی کہا تھا:

''ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے''

اب میرے چاہنے والے اس مصرعے کو اس طرح بھی دہرا سکتے ہیں:

''سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے''

تو بچو مجھے پہچانو! میں اردو ہوں، وہ زبان جس نے تمھیں گویائی کی قوت دی ہے۔ مجھے بولو، پڑھو اور لکھو میں تمھاری تہذیبی اور ثقافتی پہچان ہوں اور میرا مستقبل تمھارے ہاتھوں میں ہے۔

پیارے بچو! تم نے 1857 کا ذکر کتابوں میں پڑھا ہوگا۔ یہ وہ سال ہے جس سے میرا بہت گہرا تعلق ہے۔ ہندوستان پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں پر جبر و تشدد کرنا شروع کر دیا۔ ان کے ظلم سے تنگ آ کر ہندوستانیوں نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف 1857 میں بغاوت کر دی، اس وقت ہر ہندوستانی کی زبان سے ''انقلاب زندہ باد'' کی آواز میں، میں بول رہی تھی۔ سیاسی قائدین، مذہبی رہنماؤں، شاعروں، ادیبوں کے دل و دماغ کی ترجمان میں تھی۔ عوام و خواص کے اندر جوش و ولولہ پیدا کرنے والی میں تھی۔ شہروں شہروں، گاؤں گاؤں، گلیوں گلیوں میں میری دھوم تھی۔ میں ہر ایک کے دل کی آواز تھی۔ کسی کی زبان سے نکلا:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

لوگوں نے اس شعر کو اتنا دہرایا کہ اصل تخلیق کار کی شناخت گم ہو گئی۔ کسی نے اسے حسرت موہانی سے منسوب کیا تو کسی نے رام پرساد بسمل سے لیکن اس شعر کے اصل خالق تھے بسمل عظیم آبادی۔ تحریک آزادی میں، میں نے روح پھونک دی۔ نظموں، تقریروں اور خطبوں میں میرے استعمال سے جان پڑ گئی۔

بچو! 1857 کی بغاوت کچل دی گئی۔ انگریزوں نے مکمل طور پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ لیکن وہ سمجھ گئے کہ اردو زبان میں وہ طاقت ہے کہ اس کے ذریعے سارے ہندوستانیوں کو یکجا کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ زبان ہے جس کے ذریعے اپنی بات عوام تک بہ آسانی پہنچائی جا سکتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انگریزوں نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا، اس کالج کا خاص مقصد نو وارد انگریزوں کو اردو زبان سکھانا تھا۔ فورٹ ولیم کالج میں میری خوب پرورش ہوئی۔ دوسری زبانوں کے علوم میرے قالب میں اتارے گئے۔ میں نے بصد شوق قبول کیا۔ مجھے اپنے اور پرائے سب نے استعمال کیا۔ انگریزوں کی نیت جو بھی رہی ہو لیکن میں خوب پھلی پھولی۔

بچو! برادران وطن کے اختلافات دور کرنے کے لیے سرسید نے میرا سہارا لے کر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک خوبصورت دولہن کی دو آنکھوں سے تعبیر کیا۔ مجھے پڑھو۔ اپنی گذشتہ تاریخ اور اپنے آبا و اجداد کے احوال اور ملک و قوم کے کوائف سے آگاہی حاصل ہوگی اور دلوں میں مستقبل کی تعمیر کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

□□□

121, Godawari Hostel, JNU, Delhi-110067

قومی اردو کونسل کی موبائل وین" اردو کتابوں کی موبائل نمائش" کے اندر کی ایک تصویر۔

میاسی اردو اکادمی چنئی کی ایک استقبالیہ تقریب کے موقع پر لی گئی تصویر (دائیں سے) جناب ایاز حسین کنٹری منیجر ETV، جناب موسیٰ رضا، جناب چندر بھان خیال،
پرنس آف ارکاٹ جناب محمد عبدالعلی، جناب اے محمد اشرف کنوینر میاسی اردو اکادمی اور جناب ملک العزیز۔

Date of Publication : 24/07/2009
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

URDU DUNIYA Monthly, August 2009, Vol. 11, Issue: 8
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کی موبائل وین "اردو کتابوں کی موبائل نمائش" کی روانگی کے موقعے پر وزیر محترم کپل سبل صاحب نے "اردو دنیا" کے تازہ شمارے کی رونمائی بھی کی۔
ساتھ ہیں قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب چندر بھان خیال (درمیان میں) اور قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ۔

Printed and Published by Dr. M. Hamidullah Bhat, Director, NCPUL on behalf of NCPUL West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 70 GSM Paper produced by TNPL Editor: Dr. M. Hamidullah Bhat, Tel: 26103381, 26103938